سونے کی گیند
اور دوسرے ڈرامے

میرزا ادیب
جمع و ترتیب: اعجاز عبید

سونے کی گیند

پہلا منظر

(ایک اوسط درجے کا کمرا۔ درمیان میں ایک میز۔ میز کے اِرد گِرد چند کُرسیاں۔ ایک کرسی پر عذرا، دوسرے پر فریدہ، اور اس کے سامنے کی کرسی پر تحسین بیٹھا ہے۔ میز کے اوپر ایک ڈبہ پڑا ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے عذرا اپنے منہ میں لڈّو ڈال رہی ہے۔ تحسین کے ہاتھ میں لڈّو دکھائی دے رہا ہے اور فریدہ کا منہ ہل رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لڈّو کھا رہی ہے)

فریدہ: (لڈّو نگلتے ہوئے) تحسین!
تحسین: کیوں فریدہ!
فریدہ: کھاتے کیوں نہیں؟ ہاتھ میں لڈّو پکڑے کیوں بیٹھے ہو؟
تحسین: کھا لیتا ہوں۔
فریدہ: یہ آخری لڈّو ہے نا؟
تحسین: پانچواں ہے۔
عذرا: آخری ہوا نا۔ پانچ پانچ لڈّو ہی تو ملے تھے ہر ایک کو؟
تحسین: اجّو باجی!
عذرا: کیا ہے!
تحسین: تم نے سارے کے سارے کھا لیے ہیں۔
عذرا: اور کیا کرتی؟ امی نے رکھنے کے لیے تو نہیں دیئے تھے۔
فریدہ: نغمہ نے تو ایک بھی نہیں کھایا ہو گا۔
عذرا: اس کے پاس تو کم از کم سات روز تک پڑے رہیں گے۔ پھر ہر روز ایک لڈّو کھائے گی۔
تحسین: اور ہمیں ترسائے گی۔
عذرا: اس کی تو عادت ہے کہ ہمیں دِکھا دِکھا کر مٹھائی کھائے۔
فریدہ: ہم ہر چیز جھٹ پٹ کھا لیتے ہیں اور پھر وہ ہمیں دِکھا دِکھا کر کھاتی ہے۔
عذرا: امّی بھی تو اس سے بڑی خوش ہیں۔
فریدہ: اور ہمیں کہتی ہیں کہ تم تینوں بھوکے ہو، ندیدے ہو، ادھر چیز ہاتھ میں آئی اور اُدھر پہنچی پیٹ میں۔ کیا مجال جو صبر سے کام لو۔ توبہ کیا ندیدہ پن ہے؟ چٹورے کہیں کے۔
عذرا: لڈّو دیتے ہوئے بھی تو امی نے کہا تھا کہ تم لوگ فوراً نگل جاؤ گے اور میری نغمہ کسی طریقے اور قاعدے سے کھائے گی۔
فریدہ: ہوں! بڑے طریقے اور سلیقے سے کھاتی ہے۔
تحسین: اور جب کھاتی ہے تو ہمیں مُسکرا مُسکرا کر دیکھتی بھی جاتی ہے۔
فریدہ: اور امی کہا کرتی ہیں، دیکھو اچھے بچے یوں صبر کے ساتھ چیز کھایا کرتے ہیں۔
تحسین: میرا تو جی چاہتا ہے کہ بچی جہاں اپنی چیز رکھے وہاں سے چُپ چاپ اٹھا کر کھا لیا کروں۔

فریدہ: توبہ کرو تحسین! بڑے چالاک ہے یہ نغمہ بانو۔
عذرا: چالاک تو بڑی ہے، پر کسی دن ایسا سبق دوں گی اسے کہ یاد رکھے گی ہمیشہ
تحسین: سبق کیا دو گی اجّو باجی!
عذرا: سبق کیا دوں گی؟ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں ابھی!
فریدہ: سبق دو گی۔ خاک بھی نہیں دے سکتیں تم!
عذرا: میں اس سے زیادہ چالاک ہوں!
فریدہ: جانتی ہوں جیسی چالاک ہو تم۔ اس دن کتنی خوشامد سے کہا تھا اس سے، نغمہ پیاری بہن! میرا منہ کڑوا ہو گیا ہے۔ تھوڑی سے کھیر تو دے دو۔ اور وہ ہنس پڑی تھی۔
تحسین: صرف ہنس نہیں پڑی تھی؟ کہا نہیں تھا اس نے میں جانتی ہوں تمہاری مکاری۔
فریدہ: اور اجّو منہ دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔
تحسین: یاد ہے باجی!
عذرا: بڑی چالاک بنی پھرتی ہے۔ ابھی میرا ہاتھ نہیں دیکھا اس نے۔
فریدہ: تو دِکھا دو ہاتھ۔ سوچ کیا رہی ہو؟
تحسین: فریدہ باجی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔
عذرا: اگر ایسا چکر دے دوں کہ وہ حیران ہو جائے تو پھر کیا کہا گے تحسین؟
تحسین: ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب تک کتنی بار تم نے اور فریدہ نے اسے بنانے کی کوشش کی ہے مگر آج تک وہ کسی دھوکے میں نہیں آئی، بلکہ اُلٹا تمہارا مذاق بنایا جاتا رہا ہے۔
عذرا: سچی بات یہ ہے کہ میں نے آج تک اسے چکر دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ورنہ اس کی کیا مجال جو بچ کے نکل جائے۔
فریدہ: عذرا! چھوڑو یہ بات۔
تحسین: ہاں باجی! تم اسے کبھی، کبھی اور کبھی نہیں بنا سکتیں۔
عذرا: (غصے سے پاؤں زمین پر مار کر) غلط۔
فریدہ: عذرا! خدا کے لیے کمرے کا فرش تو نہ توڑو۔
تحسین: باجی ایک بار اور اسی طرح فرش پر پاؤں مارا تو زلزلہ آ جائے گا سچ مچ۔ دیواریں گر پڑیں گی۔
فریدہ: بلکہ چھت بھی گر پڑے گی۔
(عذرا سر جھکائے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے)
تحسین: باجی کو غصہ آ گیا ہے۔
فریدہ: (ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے) خاموش!
تحسین: کیا ہوا؟
فریدہ: سوچ رہی ہیں۔ دیکھتے نہیں کس طرح سر جھکا کر چل رہی ہیں۔
تحسین: کیا سوچ رہی ہیں؟
فریدہ: میں کیا جانوں۔
(عذرا ان کی طرف آتی ہے)
عذرا: نغمہ ہے کہاں؟
فریدہ: اپنے کمرے میں ہے اور کہاں ہو گی۔
عذرا: اگر آج اس سے پانچوں کے پانچوں لڈّو لے آؤں تو پھر مان جاؤ گے نا!
فریدی اور تحسین: ہاں!
عذرا: تو رات ہونے دو۔
فریدہ: شام تو ہو چکی ہے۔
عذرا تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ پھر دیکھنا ہوتا کیا ہے۔
تحسین: کیا ہو گا؟
عذرا: دیکھ لو گے اپنی آنکھوں سے۔
تحسین: کیا دیکھ لیں گے؟
عذرا: یہ نہیں بتاؤں گی ابھی۔ وہ چکر چلاؤں گی، وہ چکر چلاؤں گی کہ ہنس ہنس کر تمہارے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔

تحسین: اچھا!
عذرا: اور وہ نغمہ۔ ۔ اس بے چاری کا کیا حال ہو گا؟ یہ بھی دیکھ لو گے۔
فریدہ: رو پڑے گی۔
عذرا: اتنی پریشان ہو گی کہ۔ کہ۔ کہ۔
فریدہ: بس بس! دیکھتے ہیں کیا کرتی ہو۔
عذرا: اگر نغمہ نے اپنی خوشی سے پانچوں لڈو میرے حوالے کر دئیے تو؟
فریدہ: بازار سے پانچ لڈو خرید کر تمہارے حوالے کر دوں گی۔
تحسین: اور اب میں بھی باجی کو پانچ لڈّو دوں گا۔
عذرا: تو اب مجھے اپنا کام کرنے دو۔
(عذرا جلدی سے کمرے سے نکل جاتی ہے اور پردہ گرتا ہے)
**

دوسرا منظر

(نغمہ کا کمرا۔ نغمہ کوچ میں دھنسی ہوئی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ کوچ کے پاس ایک تپائی کے اوپر ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ ارد گرد اندھیرا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے)

نغمہ: (خود سے) پتا نہیں کون ہے۔ (بلند آواز سے) کون ہے؟
آواز: میں ہوں۔
نغمہ: (خود سے) کس کی آواز ہے؟ امی کی تو نہیں ہے (بلند آواز سے) کون ہو؟ بتاؤ نا؟
آواز: میں ہوں۔ ذرا دروازہ کھولو۔
نغمہ: خدا جانے کون ہے۔ خیر، دیکھتی ہوں (بلند آواز سے) اچھا!
(نغمہ کوچ سے اٹھتی ہے۔ دروازے کی طرف جاتی ہے۔ دروازہ کھولتی ہے۔ سامنے ہلکے اندھیرے میں شال میں لپٹی ہوئی کوئی بوڑھی عورت دکھائی دیتی ہے۔ صرف اس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ نغمہ اسے دیکھتی ہے اور چپ چاپ کھڑی رہتی ہے)
بڑھیا: اچھی لڑکی!
نغمہ: جی آپ کون ہیں؟
بڑھیا: ابھی بتاتی ہوں۔ کیا میں تمہارے کمرے میں آ کر بیٹھ سکتی ہوں؟
نغمہ: کام کیا ہے آپ کو؟
بڑھیا: میں نے سنا ہے کہ اچھی لڑکیاں مہمانوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتی ہیں۔
نغمہ: امی کو بلاتی ہو۔
بڑھیا: میں تو تمہاری مہمان ہوں۔ تمہاری امی کی نہیں۔
نغمہ: میری مہمان!
بڑھیا: ہاں! اچھی لڑکی!
نغمہ: مگر آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟
بڑھیا: یہیں دروازے پر بتا دوں؟
نغمہ: اچھا تشریف رکھیے۔
(نغمہ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ بڑھیا آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور کوچ پر ایک کونے میں بیٹھ جاتی ہے)
بڑھیا: کیا پڑھا جا رہا ہے؟
نغمہ: امتحان قریب ہے۔ تیاری کر رہی ہوں۔
بڑھیا: تم تو ہمیشہ جماعت میں اوّل رہتی ہو۔ شاباش تم پر! اچھی بچیاں اس طرح عزت حاصل کرتی ہیں۔
(نغمہ گھبرا جاتی ہے)
بڑھیا: گھبراتی کیوں ہو لڑکی؟

نغمہ: جی نہیں، مگر آپ۔۔ ۔
بڑھیا: اس لیے گھبرا رہی ہو کہ نہیں جانتیں میں کون ہوں۔
نغمہ: جی؛۔ کیا عرض کروں۔
بڑھیا: تمہارا نام کیا ہے؟ لیکن میں تو جانتی ہوں تمہارا نام نغمہ ہے۔
نغمہ: آپ میرا نام جانتی ہیں؟
بڑھیا: کیا تمہارا نام نغمہ نہیں ہے؟
نغمہ: یہی نام ہے۔
بڑھیا: میں پرستان سے آئی ہوں۔
نغمہ: پرستان سے! تو آپ ______
بڑھیا: میں پری ہوں۔
نغمہ: آپ پری ہیں؟ مگر آپ تو بوڑھی ہیں!
بڑھیا: واہ کیا بات کہی ہے، پریاں بوڑھی نہیں ہوتیں؟ ہمیشہ جوان ہی رہتی ہیں؟
نغمہ: مجھے خبر نہیں تھی اس کی۔
بڑھیا: تم نے اپنی کتابوں میں نیلم پری، گل نار پری، الماس پری کی کہانیاں پڑھی ہیں جو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور انہی میں سے شاید ایک میں بھی ہوں۔
نغمہ: آپ؟
بڑھیا: ہاں!
نغمہ: آپ کون ہیں؟
بڑھیا: میں نے بتایا نہیں کہ پرستان سے آئی ہوں۔
نغمہ: آپ پری ہیں۔۔ مگر میں نے پوچھا یہ ہے کہ جن پریوں کے آپ نے نام لیے ہیں۔ ان میں آپ کون ہیں؟
بڑھیا: الماس۔
نغمہ: الماس کی میں نے کوئی کہانی نہیں پڑھی۔
بڑھیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تم نے کئی پریوں کی کہانیاں نہیں پڑھیں۔ کسی دن پڑھ لو گی۔ اچھا اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ آج کی رات میں پرستان سے نکل کر تمہارے پاس آئی کیوں ہوں۔ اف تمہارے ملک میں بڑی سردی ہے!
نغمہ: ہیٹر لے آؤں دوسرے کمرے سے؟
بڑھیا: کسی کو خواہ مخواہ بے آرام کرو گی۔ رہنے دو۔ یہ شال جو اوڑھ رکھی ہے۔ جانتی ہو یہ شال کس کی ہے؟
نغمہ: جی نہیں۔
بڑھیا: ایک مرتبہ تمہارے ملک کی ایک عورت ہمارے ملک میں آ گئی تھی۔ پتا نہیں کس طرح آ گئی تھی پر آ گئی تھی اور میری سہیلی بن گئی تھی۔ یہ شال اس نے مجھے دی تھی۔
نغمہ: اچھا!
بڑھیا: ہمارے پرستان میں تو بالکل سردی نہیں ہوتی۔
نغمہ: تو آپ آئی کیوں ہیں؟
بڑھیا: بات یہ ہے نغمہ! پرستان کی ملکہ کو انسان کے بچوں سے بڑا پیار ہے۔ خاص طور پر وہ ان بچیوں کو بے حد پسند کرتی ہیں جو بہت اچھی اور نیک ہوتی ہیں۔ خوب محنت کرتی ہیں اور اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہیں۔ سمجھ گئیں۔
نغمہ: جی ہاں!
بڑھیا: ہماری ملکہ ہر سال کے شروع میں ایسی بچیوں کو پرستان سے کچھ تحفے بھجواتی ہیں۔ اچھے اچھے تحفے۔
نغمہ: اچھا!
بڑھیا: ہاں! چھ سات پریوں کی چھ سات تحفے دیئے جاتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ جن انسانی بچیوں نے سال بھر میں نام پیدا کیا ہو انہیں یہ تحفے دے آؤ۔ مجھے بھی اس مرتبہ ایک تحفہ ملا ہے۔
نغمہ: ایک تحفہ ملا ہے!
بڑھیا: اور وہ تحفہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔
نغمہ: میرے لیے!
بڑھیا: ہاں!

نغمہ: واقعی؟
بڑھیا: پریاں کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتیں۔
نغمہ: تو آپ کو کس طرح پتا چلا کہ میں امتحان میں اول رہتی ہوں؟
بڑھیا: پرستان کی بعض پریاں تمہارے ملک میں گھومتی رہتی ہیں۔ اور اچھی بچیوں کے بارے میں معلوم کرتی رہتی ہیں۔
نغمہ: پرستان کی ملکہ نے مجھے تحفہ بھیجا ہے؟
بڑھیا: ہاں! اور وہ تحفہ ہے سونے کی ایک گیند۔
نغمہ: سونے کی گیند!
بڑھیا: یہ رہی۔
(بڑھیا شال سے اپنا ہاتھ باہر نکالتی ہے۔ اس میں ایک صندوقچہ ہے)
نغمہ: گیند! سونے کی گیند! واہ وا۔
بڑھیا: گیند اس کے اندر ہے اور یہ لو چابی۔
(بڑھیا نغمہ کو چابی دے دیتی ہے)
نغمہ: شکریہ! بہت بہت شکریہ!
بڑھیا: میں تمہارا شکریہ اپنی ملکہ تک پہنچا دوں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔
نغمہ: میں نے آپ کی خاطر تو کی ہی نہیں۔
بڑھیا: شکریہ نغمہ! ہاں ایک بات ہے۔
نغمہ: فرمائیے!
بڑھیا: پرستان میں بھی ننھی بچیاں ہوتی ہیں جو انسانی بچیوں سے کوئی تحفہ پا کر بے حد خوش ہوتی ہیں۔
نغمہ: تو میں کیا پیش کروں؟ اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔
بڑھیا: پرسوں ایک پری واپس پرستان گئی تھی تو ایک بچی کی طرف سے کچھ مٹھائی لے گئی تھی۔
نغمہ: پریاں مٹھائی کھاتی ہیں؟
بڑھیا: بہت شوق سے۔ بڑے مزے سے۔
نغمہ: اچھا تو۔۔۔ ۔ میرے پاس اس وقت پانچ لڈو ہیں۔
بڑھیا: لڈو! سنا ہے یہ مٹھائی بڑی لذیذ ہوتی ہے۔
نغمہ: میں یہ لڈو دے دوں ننھی پریوں کو؟
بڑھیا: میں یہ لڈو ننھی پریوں کو دے دوں گی۔
نغمہ: تو ٹھہریے ذرا۔ ابھی آتی ہوں۔
(نغمہ تیزی کے ساتھ کمرے میں سے نکل جاتی ہے۔ بڑھیا شال درست کرتی ہے۔ تین چار لمحے گزر جاتے ہیں۔ نغمہ لوٹ کر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا ہے)
بڑھیا: واہ وا! وہ تو خوش ہو جائیں گی۔
نغمہ: خدا کرے ایسا ہو۔
(بڑھیا ڈبا ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اٹھتی ہے)
بڑھیا: (چلتے ہوئے) وہ گیند دیکھ لو نا۔
نغمہ: اچھا!
(نغمہ چابی سے صندوقچہ کھولتی ہے اور اس میں سے ایک عام سے گیند نکلتی ہے۔ دروازے سے فریدہ اور تحسین ہنستے ہوئے آتے ہیں۔ بڑھیا شال اتار دیتی ہے۔ اب وہ عذرا ہے۔ نغمہ اس طرح انہیں دیکھتی ہے جیسے حیران رہ گئی ہے)
عذرا: (اپنی اصلی آواز میں) کیوں؟ کیسا چکر دیا؟
تحسین: باجی اجو! آج تمہیں استاد مان لیا ہے میں نے۔
فریدہ: نہیں استادوں کی استاد! عذرا کمال کر دیا تم نے۔
نغمہ: لڈو لینا چاہتی تھیں تو مانگ لیتیں۔ میں دے دیتی۔ اس طرح دھوکا کیوں دیا ہے؟
عذرا: مزہ تو اس طرح لینے میں ہے۔ دس لڈو اور ملیں گے مجھے۔
تحسین: نغمہ! سونے کی گیند کیسی ہے؟
فریدہ: واہ وا! کیا گیند ہے۔ پرستان سے آئی ہے۔

عذرا: پرستان کی ملکہ نے بھیجی ہے۔
(تینوں زور زور سے قہقہے لگاتے ہیں۔ نغمہ حیران پریشان دکھائی دیتی ہے)
تحسین: اجو باجی! نکالو لڈو!
فریدہ: اس کے سامنے کھاتے ہیں۔
عذرا: کیوں نہیں۔
(عذرا ڈبا کھولتی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے)
فریدہ: ارے اس میں تو کوئلے ہیں۔
تحسین: کوئلے!
نغمہ: (مسکرا کر) آداب عرض ہے جناب! کھائیے لڈو۔ شوق سے کھائیے۔ نغمہ کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ کھائیے لڈو۔ بڑے مزے دار ہیں۔ ہی ہی ہی ہا ہا ہا!
(نغمہ قہقہہ لگاتی ہے۔ تحسین، عذرا اور فریدہ حیران پریشان کھڑے ہیں۔ پردہ گر جاتا ہے)
***

گڑیا کی سال گرہ

منظر

(سلمیٰ کا کمرہ، سلمیٰ میز کی چیزیں اٹھا اٹھا کر اس انداز سے دوسری جانب رکھ رہی ہے، جیسے کوئی چیز تلاش کر رہی ہے۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ گھبراہٹ میں ایک موٹی کتاب فرش پر گر پڑتی ہے۔ سلمیٰ جلدی سے کتاب اٹھانے کے لیے جھکتی ہے اور جیسے ہی کتاب اٹھانے لگتی ہے، دروازے کے قریب اس کی باجی آتی ہیں۔ باجی کے لہجے میں غصہ ہے)

باجی: یہ کیا ہو رہا ہے سلمیٰ!
سلمیٰ: کچھ نہیں باجی! وہ۔۔۔ دیکھیے نا باجی!۔ ۔ وہ (کتاب میز کے اوپر رکھ دیتی ہے) پتا نہیں وہ کدھر غائب ہو گئی۔
باجی: کتابیں تو نیچے گرائی جا رہی ہیں اور ابھی کچھ ہو ہی نہیں رہا! کیا میز کو بھی الٹ دینے کا ارادہ ہے؟
(باجی کمرے کے اندر آ جاتی ہیں)
سلمیٰ: کیا کروں باجی؟ وہ مل جو نہیں رہی۔ آخر کیا کروں؟
باجی: کر تو رہی ہو اور کیا کرو گی۔ بات کیا ہے آخر؟ تلاش کس چیز کی ہے؟ کہو کیا گیا ہے جس کے لیے یوں پریشان ہو؟
سلمیٰ: میری یاسمین گم ہو گئی ہے باجی!
باجی: یاسمین گم ہو گئی ہے؟
سلمیٰ: جی ہاں!
باجی: تو یہاں کہاں آ گئی کو تم نے میز کی ساری چیزیں الٹ پلٹ دی ہیں؟ کسی الماری ولماری میں ہو گی۔ دیکھا بھی الماریوں میں؟
سلمیٰ: سب الماریاں دیکھ چکی ہوں باجی!
(باجی ایک الماری کھول کر اس کے اندر دیکھتی ہے)
باجی: یہاں تو نہیں ہے۔
سلمیٰ: پتا نہیں، کہاں غائب ہو گئی۔
باجی: تمہیں اس کا علم ہونا چاہیے ___ گڑیا تمہاری ہے کسی اور کی تو نہیں ہے ÷
سلمیٰ: خبر نہیں کون لے گیا ہے؟
باجی: لے جا کون سکتا ہے (الماری کے پٹ بند کرتے ہوئے) یہیں کہیں ہو گی۔ ذرا اطمینان کے ساتھ ڈھونڈو، مل جائے گی۔ جائے گی کہاں آخر؟

سلمیٰ: دیکھ چکی ہوں سارے کمروں میں۔ کہیں بھی تو نہیں مل رہی۔۔ ۔ پتا نہیں باجی۔۔۔۔
باجی: کچھ یاد ہے؟ رکھا کہاں تھا اسے؟
سلمیٰ: اسی میز کے اوپر۔
باجی: بھول گئی ہو۔۔ یہاں رکھا ہوتا تو ضرور مل جاتی۔۔ کہیں اور رکھ کر بھول گئی ہو اور اب پریشان ہو کر چیزوں کا ناس کر رہی ہو یہی نتیجہ ہوتا ہے بے پروائیوں کا۔ قرینے سے رکھو کیوں؟ قرینے سے تو پرہیز ہے تم لوگوں کو۔
سلمیٰ: مجھے اچھی طرح یاد ہے، کپڑے پہنا کر اسے یہیں رکھا تھا۔ آپ کو معلوم ہے آج اس کی سال گرہ ہے۔
باجی: سال گرہ؟ خوب خوب۔ جبھی صبح سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔
سلمیٰ: (رونی صورت بنا کر) ابھی میری سہیلیاں آ جائیں گی۔
باجی: ہاں! وہ تو آئیں گی ہی۔ دعوت جو دے رکھی ہے انہیں۔
سلمیٰ: تو پھر کیا ہو گا؟
باجی: تمہاری یاسمین تو گئی۔۔ ۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ کسی اور گڑیا کی سال گرہ کر دو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا اس سے۔
سلمیٰ: یہ کیسے ہو سکتا ہے باجی! سب نے یاسمین کو دیکھا ہوا ہے اور سب جانتی ہیں کہ سال گرہ یاسمین کی ہے۔
باجی: یاسمین کو شاید کوئی چرا کر لے گیا ہے۔ یا ہو سکتا ہے اس کے پر لگ گئے ہوں اور وہ کھڑکی کے راستے اڑ گئی ہو۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔
سلمیٰ: باجی میرا خیال ہے شوکت۔۔ ۔
باجی: شوکت لے گیا ہے؟ وہ کیا کرے گا تمہاری گڑیا کا؟
سلمیٰ: مجھے تو پریشان کرے گا نا۔
باجی: شوکت نے ایسی شرارت کبھی نہیں کی۔ اسے کیا ضرورت تھی تمہاری گڑیا چھپانے کی۔
(دروازے کی طرف جاتے ہوئے)
دیکھو! اب چیزیں الٹ پلٹ مت کرو۔ کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی خواہ مخواہ۔
سلمیٰ: تو ڈھونڈوں کیسے؟
باجی: کسی اور کمرے میں دیکھو جا کر۔
سلمیٰ: سب کمروں میں دیکھ آئی ہوں باجی!
باجی: اچھا اطمینان سے دیکھو!
(سلمی اس الماری کی طرف جانے لگتی ہے۔ جسے اس کی باجی نے چند لمحے پہلے کھولا تھا۔ باجی دروازے میں سے نکل جاتی ہیں۔ کسی قدر دور سے خالدہ کی آواز آتی ہے، سلمیٰ! سلمیٰ الماری کا بھی ایک ہی پٹ کھول سکی ہے کہ رک جاتی ہے۔ اور بلند آواز سے کہتی ہے ’’آؤ خالدہ‘‘ سلمیٰ الماری کا دوسرا پٹ بھی کھول کر دیکھتی ہے۔۔ ۔ خالدہ آتی ہے)
خالدہ: ہو گئیں تیاریاں؟
(سلمیٰ الماری کے پٹ بند کر دیتی ہے اور خالدہ کی طرف پلٹ کر دیکھتی ہے)
سلمیٰ: خاک تیاریاں ہو گئیں۔
خالدہ: کیوں؟ خیر تو ہے؟
سلمیٰ: جس کی سال گرہ ہے وہی نہیں ہے۔
خالدہ: کیا مطلب؟
سلمیٰ: میری یاسمین ہی غائب ہو گئی ہے۔
خالدہ: ہائے! یاسمین غائب ہو گئی ہے! سچ؟
سلمیٰ: تو کیا جھوٹ بولوں گی تم سے؟
خالدہ: یعنی یاسمین۔۔ ۔
سلمیٰ: (غصے سے) ہاں ہاں! یاسمین گم ہو گئی ہے۔
خالدہ: یہ تو غضب ہی ہو گیا ہے۔
سلمیٰ: ابھی سب لوگ آ جائیں گے۔
خالدہ: جس کی سال گرہ ہے وہی نہ ہوئی تو پھر کیا ہو گا۔
سلمیٰ: اسی بات پر تو میں پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟
خالدہ: تو۔۔۔۔ ۔ تو (کچھ سوچنے لگتی ہے)

سلمیٰ: تو---- -- تو کیا؟
خالدہ: سال گرہ تو ضرور ہونی چاہیے۔
سلمیٰ: کیو نہیں---- - مگر جس کی سال گرہ ہونے ہے وہ کہاں ہے؟
خالدہ: میں بتاؤں؟
سلمیٰ: کہو!
خالدہ: میری غزالہ دیکھی ہے نا؟
سلمیٰ: کئی مرتبہ-- - مگر تمہارا مطلب کیا ہے؟
خالدہ: یاسمین کی بجائے غزالہ۔
سلمیٰ: نہ جی معاف کرو۔ سال گرہ ہو گی تو یاسمین کی ہو گی۔
خالدہ: ورنہ نہیں ہو گی۔
(سلمیٰ سوچ میں پڑ جاتی ہے)
خالدہ: میں کہتی ہوں۔ یاسمین بڑی خوب صورت گڑیا ہے۔ مگر میری غزالہ بھی کم خوب صورت نہیں ہے۔ سچ کہو! ایسی پیاری گڑیا کہیں دیکھی ہے تم نے؟
سلمیٰ: اچھی گڑیا ہے۔
خالدہ: اچھی نہیں-- - بہت اچھی-- - بہت پیاری۔ اتنا سجا بنا کر رکھتی ہوں کہ کیا کہوں۔ تمہاری یاسمین سے اگر زیادہ نہیں تو کم خوب صورت بھی نہیں ہے۔
سلمیٰ: سچ پوچھو تو میرا دل نہیں مانتا کہ کسی اور گڑیا کی سال گرہ کروں۔
خالدہ: کسی اور کی گڑیا کہاں ہے۔ غزالہ بھی تمہاری ہی گڑیا ہے۔ میں تو یاسمین اور غزالہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ تم دیکھو گی تو تڑپ ہی اٹھو گی۔ صبح ہی میں نے اسے نئے کپڑے پہنائے ہیں۔ کراچی سے میری خالہ زاد بہن اصغری آ رہی ہے۔ اس کی گڑیا سے بیاہ کا ارادہ ہے۔
سلمیٰ: اچھا!
خالدہ: تو لے آؤں میں جا کر؟ پل بھر (چٹکی بجا کر) میں لے آؤں گی۔ لے آؤں نا؟
سلمیٰ: تو اور کیا کرو گی؟ بنی سجی ہے نا؟
خالدہ: بہت بہت بنی سجی ہے۔ صبح ہی تو اسے نئے کپڑے پہنائے ہیں۔
(خالدہ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)
سلمیٰ: خالدہ! دیکھو بتانا نہیں کسی کو کہ سال گرہ غزالہ کی ہو رہی ہے۔ ویسے میں یاسمین کو تلاش کرتی رہوں گی۔ اللہ کرے مل جائے۔
(خالدہ چلی جاتی ہے۔ کسی قدر قریب سی سیٹی کی آواز اتی ہے۔ شوکت آتا ہے)
شوکت: واہ وا! آج تو بڑے ٹھاٹ ہیں۔ مٹھائیوں کی خوش بو آ رہی ہے (سونگھتا ہے) مزا ہی آ جائے گا۔
سلمیٰ: شوکت! سچ بتاؤ۔ یاسمین کو تم نے تو نہیں چھپا دیا کہیں؟
شوکت: سبحان اللہ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ، میں تو پورے ایک سال سے اس کی سال گرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ یاسمین کو چھپا دوں گا تو سال گرہ کس کی ہو گی اور سال گرہ نہیں ہو گی تو نقصان ہمارا ہے کسی اور کا تو نہیں ہے۔
سلمیٰ: ہو سکتا ہے تم نے شرارت کی ہو۔
شوکت: میں گڑیا سے نہیں کھیلا کرتا۔ فٹ بال سے کھیلا کرتا ہوں۔ تمہاری گڑیا سے صرف آج کے دن کے لیے دل چسپی ہے۔ کیوں کہ اس کی سال گرہ ہے۔
سلمیٰ: تم نے اسے دیکھا تو ہو گا؟
شوکت: ہاں دیکھا تھا۔
سلمیٰ: کب؟
شوکت: پچھلے ہفتے۔
سلمیٰ: جاؤ! مجھے پریشان مت کرو۔
شوکت: پریشان تو تم کر رہی ہو۔
سلمیٰ: میں کیسے پریشان کر رہی ہوں؟
شوکت: سال گرہ جو نہیں ہو گی۔

سلمیٰ: سال گرہ ضرور ہو گی۔ ۔ یاسمین کی نہ سہی، کسی اور کی گڑیا کی کر دیں گے۔
شوکت: بہت اچھا۔ بہت بہت اچھا۔
سلمیٰ: ذرا دیکھو۔۔۔ اپنے کمرے میں اسے ڈھونڈو تو سہی۔ ممکن ہے مل جائے۔۔۔ کرو گے نا مدد؟
شوکت: ضرور مدد کروں گا۔
(شوکت سیٹی بجاتا ہوا نکل جاتا ہے۔ عذرا آتی ہے)
عذرا: سلمیٰ! تمہاری باجی کیا کہہ رہی ہیں؟
سلمیٰ: ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔
عذرا: سچ مچ یاسمین۔ ۔
سلمیٰ: ہاں!
عذرا: مگر تیاریاں تو ہو رہی ہیں۔ ۔ یہ کیوں؟
سلمیٰ: اس لیے تیاریاں ہو رہی ہیں کہ سال گرہ ضرور ہو گی۔
عذرا: میں کچھ سمجھی نہیں۔
سلمیٰ: یاسمین غائب ہو گئی ہے تو کیا میری سہیلیوں کی گڑیاں بھی غائب ہو گئی ہیں؟
عذرا: اللہ نہ کرے۔
سلمیٰ: تو بس معاملہ ٹھیک ہے۔
(سلمیٰ پھر الماری کی طرف جانے لگتی ہے۔ عذرا دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ سلمیٰ ایک ڈبا نکالتی ہے، اسے کھولتی ہے۔ اس میں کوئی رنگین رنگین کپڑا ہے۔ کپڑے کو پھر ڈبے میں کرھ کر اسے بند کر دیتی ہے۔ خالدہ بھاگتی ہوئی آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا ہے۔ سلمیٰ الماری سے الگ ہو جاتی ہے)
خالدہ: لو سلمیٰ!
(خالدہ ڈبا کھولتی ہے۔ اس میں سے ایک خوب صورت گڑیا نکالتی ہے)
کیوں کیسی ہے؟
سلمیٰ: اچھی ہے!
خالدہ: بہت اچھی کیوں نہیں کہتیں؟ پتا ہے رضیہ نے کیا کہا ہے اسے دیکھ کر؟
سلمیٰ: کیا کہا ہے؟
خالدہ: کہنے لگی، ایسی گڑیا تو میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہے۔
سلمیٰ: یاسمین مل جاتی تو بہت اچھا رہتا۔ خیر اب غزالہ ہی کی سال گرہ منا لیں گے اور کیا ہو سکتا ہے۔
(باہر سے فریدہ کی آواز آتی ہے)
خالدہ: فریدہ معلوم ہوتی ہے۔
سلمیٰ: (بلند آواز سے) آؤ فریدہ!
(فریدہ آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ ہے)
خالدہ: (لفافہ کی طرف اشارہ کر کے) اس میں تحفہ ہو گا۔
فریدہ: جی ہاں!
خالدہ: دیکھوں تو۔
(فریدہ لفافے میں سے اپنی گڑیا نکالتی ہے)
سلمیٰ: ارے یہ کیا؟
خالدہ: تحفے میں اپنی گڑیا دو گی کیا؟
فریدہ: یہ تحفے میں دینے کے لیے نہیں ہے جناب۔
خالدہ: تو پھر کا ہے کو لائی ہو؟
فریدہ: اجی سال گرہ ہو گی اس کی؟
فریدہ: اور کیا؟ شوکت نے تو یہی کہا تھا مجھ سے کہ یاسمین گم ہو گئی ہے، سلمیٰ پریشان ہے۔ اپنی گڑیا لے آؤ اس کی سال گرہ ہو گی۔
سلمیٰ: میں نے تو شوکت سے ایسی بات ہرگز نہیں کہی تھی۔
خالدہ: سال گرہ تو غزالہ کی ہو گی۔

فریدہ: غزالہ کی ہو گی تو پھر میری بانو کو کیوں بلایا تھا؟
سلمیٰ: میں نے ہرگز نہیں بلایا۔
فریدہ: تو پھر مجھے الہام تو نہیں ہوا۔ پوچھ لو شوکت کو بلا کر۔ باہر ہے صحن میں۔
(سلمیٰ دروازے پر جا کر شوکت کو آواز دیتی ہے۔ شوکت آتا ہے)
شوکت: لو میں نے تمہاری پریشانی دور کر دی ہے۔
سلمیٰ: میں نے تم سے کب کہا تھا کہ فریدہ سے ایسی بات کہو جا کر؟
شوکت: تم نے تو نہیں کہا تھا مگر میرا تو فرض تھا نا کہ بہن کی پریشانی دور کروں۔ اور میں نے دور کر دی۔
سلمیٰ: یہ پریشانی دور کی ہے تم نے؟
شوکت: تو اور کیا کیا ہے؟
سلمیٰ: پریشانی بڑھا دی ہے۔
شوکت: وہ کیسے؟
سلمیٰ: سال گرہ خالدہ کی غزالہ کی ہو رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا اور وہ اپنی گڑیا لے آئی ہے۔
فریدہ: مجھے کیا خبر کہ تم نے خالدہ سے یہ بات کہہ رکھی ہے۔ شوکت نے تمہارا پیغام دیا اور میں لے آئی اپنی بانو کو تیار کر کے۔
سلمیٰ: سال گرہ تو غزالہ کی ہو گی نا اب۔
فریدہ: یہ میں کیا جانوں--- میں تو اپنی باجی اور امی سے کہہ کر آئی ہوں کہ سال گرہ میری گڑیا کی ہو رہی ہے۔
سلمیٰ: شوکت! تم نے مجھے سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ کیا غضب کر دیا ہے تم نے!
شوکت: منع کر دیا ہوتا مجھے۔
سلمیٰ: مجھے کیا خبر تھی تم فریدہ سے یہ بات کہنے جا رہے ہو۔
شوکت: اور مجھے کیا پتا تھا کہ تم خالدہ سے یہ بات کہہ چکی ہو۔
سلمیٰ: تم نے بڑی غلطی کی ہے۔
شوکت: غلطی یا تو ہم دونوں ہی نے کی ہے یا پھر کسی نے بھی نہیں کی۔
(عذرا آتی ہے، ہاتھ میں رو مال میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہے)
لیجئے بی عذرا بھی آ گئیں--- یہ بھی کچھ اٹھائے چلی آ رہی ہیں۔ مزہ آ جائے گا یہ بھی
عذرا: میں اپنی گڑیا کو لے آئی ہوں۔
شوکت: واہ وا مزا آ گیا۔ اب تو کمال ہو گیا۔ کہو سلمیٰ ہو گیا ہے نا کمال؟ عذرا! تم سے کس نے کہا تھا کہ اپنی گڑیا اٹھا کر لے آؤ؟
عذرا: کہا تو کسی نے نہیں تھا۔ سوچا سلمیٰ کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ یاسمین گم ہو گئی ہے سال گرہ ثریا کی ہی ہو جائے گی۔
شوکت: تمہارے ساتھ دو اور بھی مدد کرنے والی آ پہنچی ہیں۔ ہے نا تماشا؟
عذرا: بات کیا ہے؟
شوکت: خالدہ سے سلمیٰ نے کہا کہ اپنی گڑیا لے آؤ۔ یہ بات فریدہ سے میں نے بھی کہہ دی اور عذرا نے یہ بات اپنے آپ سے کہہ دی۔ ۔ یاسمین گم ہو گئی اور اس کی بجائے تین گڑیاں آ گئی ہیں--- اب سال گرہ ہو تو کس کی ہو؟
خالدہ: مجھ سے تو سلمیٰ نے خود کہا تھا۔
عذرا: اس کا فیصلہ تو سلمیٰ ہی کر سکتی ہے۔
فریدہ: مجھے پیغام ملا تھا--- خود تو نہیں لے آئی؟
سلمیٰ: میں نے نہ تو فریدہ سے کہا تھا اور نہ عذرا سے۔
شوکت: اب جھگڑا کس بات کا۔ تینوں کی سال گرہ کر دو۔
سلمیٰ: وہ کیسے؟
شوکت: ایک گڑیا کی سال گرہ ہو سکتی ہے تو تین گڑیوں کی کیوں نہیں ہو سکتی؟ ضرور ہو سکتی ہے اور ہو گی اور ہم مٹھائی کھائیں گے۔
سلمیٰ: میں نہیں کرتی سال گرہ۔ معاف کرو مجھے۔
شوکت: تو ان مٹھائیوں کا کیا ہو گا جو باورچی خانے میں پڑی ہیں۔
سلمیٰ: میں کیا جانوں!

فریدہ: میں تو چلی۔
عذرا: اور میں کیا ٹھہروں گی بھلا۔
خالدہ: میں باز آئی سال گرہ منانے سے۔ ایک تو گڑی لاؤ اور پھر اوپر سے باتیں سنو۔
سلمیٰ: ذرا ٹھہرو تو سہی! فیصلہ کر لیتے ہیں۔۔ ۔
(باجی آتی ہیں۔۔ ۔ ہاتھ میں گڑیا ہے)
باجی: یہ لو! باورچی خانے میں بھول آئی تھیں۔
سلمیٰ: ہائے میری یاسمین!
(سلمیٰ بے اختیار اپنی گڑیا کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ عذرا، خالدہ، اور فریدہ حیرت سے دیکھتی ہیں اور پردہ گرتا ہے)
***

یہ گھڑی کس کی ہے؟

(ایک کمرہ۔ اکرم، اشرف اور صفیہ تینوں بھائی بہن ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ میز کے اوپر کچھ آم پڑے ہیں۔ اکرم سب سے بڑا بھائی ہے۔ اس لیے وہ آم تقسیم کر رہا ہے۔ وہ تین آم اٹھاتا ہے اور اشرف کو دیتا ہے)
اکرم: لو اشرف! اپنا حصہ۔
اشرف: (آم لیتے ہوئے) بہت اچھا، لاؤ!
(اشرف آم لے کر میز کی ایک جانب رکھ دیتا ہے)
اکرم: اور یہ لو صفیہ! تم تین آم
صفیہ: شکریہ۔
(صفیہ اپنے حصے کے آم لے کر اپنے سامنے رکھ لیتی ہے۔ اکرم کے آگے باقی پانچ آم رہ جاتے ہیں)
اشرف: یہ تمہارے پاس پانچ کیوں ہیں؟
صفیہ: ہم دونوں نے تین تین لیے ہیں۔ تمہارے حصے میں پانچ کیوں آ گئے؟
اکرم: یہ دو آم زیادہ ملے ہیں اور میری وجہ سے ملے ہیں۔ اس لیے ان کا حق دار میں ہوں۔
صفیہ: وہ کیوں؟ امی نے کہا تھا کہ آم والے سے ایک سیر آم خرید کر آپس میں تقسیم کر لو۔ ہر ایک کو برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔ ہم تین تین لیں تو تم پانچ کیوں لو؟
اشرف: صفیہ درست کہہ رہی ہے۔ جب ہم دونوں کو تین تین مل رہے ہیں تو تمہیں بھی اتنے ہی ملنا چاہیے۔
اکرم: اگر نو آم ہوتے تو بے شک میں بھی تین لیتا مگر یہ ہیں گیارہ۔ دو کو تین کس طرح بنا سکتا ہوں؟ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ زائد آم دکان دار نے میری وجہ سے دئیے ہیں۔ ان پر میرا حق ہے۔
اشرف: جی نہیں۔ صرف تمہارا حق نہیں۔ میرا حق بھی ہے۔
اکرم: دکان دار نے جب پوچھا تھا کہ آم پورے ہوئے ہیں یا نہیں تو میں نے ہی کہا تھا نا کہ پورے نہیں ہوئے۔ ابھی صرف آدھ سیر ملے ہیں حالاں کہ وہ پورے ایک سیر دے چکا تھا۔ اگر میں کہہ دیتا کہ پورے آم میری جھولی میں آ چکے ہیں تو دکان دار آدھ سیر زیادہ کیوں دیتا؟
صفیہ: لیکن امی نے یہ کب کہا تھا کہ اگر دکان دار سے زیادہ آم لے لو تو جو زیادہ ملیں وہ صرف اکرم کو ملیں، دوسروں کو نہ ملیں؟
اکرم: اور امی نے یہ کب کہا تھا کہ جس کی وجہ سے زیادہ آم ملیں وہ زیادہ حصہ نہ لے، یہ دونوں آم میرے ہیں۔
اشرف: جی نہیں۔
صفیہ: بالکل نہیں۔ ہر ایک کو برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔
اکرم: ہر ایک کو برابر کا حصہ ملا ہے۔
صفیہ: کہاں برابر کا حصہ ملا ہے؟ تم پانچ کیوں لے رہے ہو؟
اکرم: اگر میں دکان دار سے کہہ دیتا کہ بڑے میاں! ہم نے ایک سیر آم لے لیے تو وہ آدھ سیر زیادہ کیوں دیتا؟ کیوں؟ یہی بات ہے نا؟

صفیہ: یہ بات تو ہے۔
اکرم: تو پھر جو آم زیادہ ہیں، وہ کس کے حصے میں جائیں گے؟ کیا ان کا حق دار میں نہیں ہوں؟
اشرف: بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔
اکرم: یہ دو تو میں ہرگز نہیں دوں گا۔
اشرف: امی نے جب کہا ہے کہ ہر ایک کو ایک جیسا حصہ ملنا چاہیے تو یہ دو بھی ہم تینوں میں تقسیم ضرور ہوں گے۔
صفیہ: ہوں گے اور ضرور ہوں گے اور اسی وقت ہوں گے۔
(امی دروازے پر آتی ہیں)
امی: اکرم! یہ شور کیوں مچا رہے ہو؟ کیا بات ہے؟
اشرف: آپ نے کہا تھا نا کہ ایک سیر آم خرید لو اور آپس میں برابر تقسیم کر لو۔
امی: ہاں کہا تھا۔
صفیہ: اکرم برابر برابر تقسیم نہیں کر رہا۔
امی: کیوں اکرم بیٹا! کیا گنتی ٹھیک نہیں ہو رہی؟
اکرم: گنتی تو ٹھیک ہے امی!
امی: پھر انصاف نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟
(تینوں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں)
امی: خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ جواب دو۔ کیا پوچھا ہے میں نے اشرف؟
اشرف: امی! وجہ یہ ہے کہ آم ایک سیر نہیں ہیں ڈیڑھ سیر ہو گئے ہیں۔
امی: میں نے کہا تو تھا کہ صرف ایک سیر خریدو پھر ڈیڑھ سیر کیوں لیے؟
صفیہ: آپ یہ اکرم سے پوچھیں۔
اشرف: میں بتاتا ہوں امی! ہوا یہ کہ دکان دار کو ایک سر کا باٹ مل نہیں رہا تھا اس نے کہا میں دو مرتبہ آدھ آدھ سیر تول کر دے دیتا ہوں۔ جب وہ ایک سیر تول چکا تو اسے خیال ہی نہ رہا کہ پورے آم تول چکا ہے۔ گاہک بہت تھے نا امی! بھول گیا۔ اس نے پوچھا ”یک سیر آم تول دئیے ہیں یا نہی؟“ تو اکرم نے کہا ”نہیں۔ ابھی صرف آدھ سیر ہوئے ہیں۔“
امی: بہت بری بات ہے اکرم! تم نے جھوٹ کیوں بولا؟ دیانت داری سے کام کیوں نہیں لیا؟
اکرم: امی! بات یہ ہوئی۔۔ ۔ کہ۔۔ ۔ امی در اصل۔
امی: اکرم بیٹا! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر دکان دار بھول گیا تھا تو تمہیں جھوٹ بول کر اس طرح فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ یہ چیز دیانت داری کے خلاف ہے اور ہر انسان کو دیانت دار ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا اکرم بیٹا بڑا دیانت دار ہے۔ مگر آج۔۔۔ ۔۔ ۔
اکرم: امی! مجھے افسوس ہے۔ شرمندہ ہوں۔ یہ دو آم ابھی دکان دار کو واپس کر کے آتا ہوں۔
امی: شاباش! اچھے بچے کبھی جھوٹ بول کر پرائی چیز کو اپنی چیز نہیں بناتے۔ جو چیز جائز طور پر ہمیں نہ ملے۔ وہ ہرگز ہماری نہیں ہو سکتی۔ جلدی واپس کر کے آؤ۔
(اکرم دو آم اٹھا کر دروازے سے نکل جاتا ہے)
دیکھو! آم ابھی رہنے دو۔ کھانا کھانے بعد کھانا۔
اشرف: بہت اچھا امی!
(امی دروازے میں سے نکل کر جانے لگتی ہیں۔ ان کے جاتے ہی سعید بیٹھتا ہے۔ وہ مسکرا رہا ہے مٹھی میں کوئی چیز بند ہے۔)
صفیہ: سعید بھیا! اس طرح مسکرا کیوں رہے ہو؟
سعید: آج تو اللہ تعالیٰ نے بیٹھے بٹھائے انعام دے دیا ہے۔
اشرف: بیٹھے بٹھائے انعام؟ وہ کیسے؟
سعید: گھر سے نکل کر تمہاری طرف آ رہا تھا کہ گلی کی نُکر پر ایک شے مل گئی۔
صفیہ: کون سی شے ملی ہے؟
سعید: میری مٹھی میں ہے۔
صفیہ: ہے کیا آخر؟ مٹھی کھول کر دکھاؤ۔
سعید: یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر وقت ٹک ٹک کرتی رہتی ہے۔
صفیہ: گھڑی تو نہیں؟

سعید: ہاں گھڑی ہے۔ سڑک پر پڑی تھی۔ میں نے جھٹ اٹھا لی۔ یہ دیکھو!
(سعید، اشرف اور صفیہ کو ایک چھوٹی سی گھڑی دکھاتا ہے۔ اکرم واپس آ جاتا ہے)
اکرم: کیا دکھا رہے ہو سعید؟
صفیہ: سعید کو یہ گھڑی ملی ہے زمین پر گری ہو۔
سعید: مزا آ گیا آج تو۔ بڑی قیمتی معلوم ہوتی ہے۔
اکرم: مگر یہ گھڑی تمہاری نہیں ہے۔
سعید: کیوں؟ میری کیوں نہیں؟
(سعید گھڑی میز پر رکھ دیتا ہے)
اکرم: اس لیے تمہاری نہیں کہ تم نے نہ تو اسے خریدا ہے اور نہ تمہارے ابا امی نے یہ تمہیں دی ہے۔ پھر تمہاری کس طرح ہوئی؟
صفیہ: ابھی ابھی ہماری امی نے کہا ہے کہ جو چیز جائز طور پر نہ ملے، وہ ہماری ہرگز نہیں ہو سکتی۔
اکرم: اس لیے سعید! یہ گھڑی تمہاری نہیں ہے۔
(سعید سوچ میں پڑ جاتا ہے)
اکرم: صرف اس کی ہے جس نے اسے خریدا ہے یا جسے کہیں سے تحفے میں ملی ہو گی۔
صفیہ: جس کی گھڑی کھو گئی ہے، وہ بے چارہ کتنا پریشان ہو گا!
اکرم: ہاں! بڑا پریشان ہو گا۔ نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرتا ہو گا۔ اس کی چیز اسے واپس مل جانی چاہیے۔
سعید: میں کیا جانوں کس کی ہے۔ مجھے تو زمین پر گری ہوئی ملی ہے۔
اکرم: وہی چھوڑ آؤ جا کر۔
سعید: تو کوئی اور اٹھا کر لے جائے گا، جس طرح میں لے آیا ہوں۔
اشرف: ہاں! گھڑی تو اسے ملنی چاہیے جس کی ہے کسی اور کو نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے مل کیسے سکتی ہے؟
صفیہ: مل سکتی ہے اور بڑی آسانی سے مل سکتی ہے۔ دو ترکیبیں ہیں۔
اشرف: کیا؟
صفیہ: ایک ترکیب یہ ہے کہ گھڑی کسی طرح وہاں پہنچ جائے جہاں اس کا مالک ہے۔ یا مالک اس جگہ آ جائے جہاں گھڑی ہے۔
اکرم: کیا ترکیب بتائی ہے!
صفیہ: اگر گھڑی کے پر ہوتے تو یہ اڑ کر وہاں پہنچ سکتی تھی۔
اکرم: اگر اس کے پر ہوتے تو یہ پرستان میں پہنچ چکی ہوتی اور اس وقت کسی پری کی کلائی پر بندھی ہوتی۔ ارے! تم کیا سوچ رہے ہو سعید!
سعید: میرے دماغ میں ایک اعلیٰ درجے کی ترکیب آئی ہے۔ ہم ڈھنڈورا پٹوا دیتے ہیں کہ جس صاحب کی گھڑی ہو، وہ آ کر لے جائیں۔
اکرم: ڈھنڈورچی کو تو پیسے دینے پڑیں گے۔ میں بتاؤں، ایک کاغذ پر لکھ کر گلی کے موڑ پر لگا دیتے ہیں۔
سعید: لکھیں گے کیا؟
اکرم: یہی کہ ہمیں ایک گھڑی ملی ہے۔ جن صاحبکی ہو، وہ یہاں تشریف لا کر لے جائیں۔
صفیہ اور اشرف: (ایک ساتھ) بالکل ٹھیک!
اکرم: سعید! تم لکھو۔ تمہارا خط اچھا ہے۔
سعید: اچھا! میں لکھ دوں گا۔ نیچے پتا کیا لکھوں؟
صفیہ: ہمارے گھر کا پتا لکھو۔
سعید: کاغذ قلم دو۔
صفیہ: دوسرے کمرے میں ہے۔
سعید: اشرف! تم آؤ میرے ساتھ لکھ کر باہر دیوار پر لگا دیتے ہیں۔
اشرف: چلو!
(سعید اور اشرف کمرے سے نکل جاتے ہیں)
صفیہ: یہ ترکیب تو بہت اچھی ہے۔ مگر ایک بات کا خطرہ ہے۔ کوئی بھی شخص آ کر کہہ سکتا ہے کہ گھڑی میری ہے۔ گلی میں لوگ آتے جاتے تو رہتے ہی ہیں جو بھی پڑھے گا گھڑی کا مالک بن جائے گا۔

اکرم: یہ خطرہ تو ہے۔ فرض کیا اشتہار گھڑی کا مالک نہیں پڑھتا، کوئی اور پڑھتا ہے۔ وہ آ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ گھڑی میری ہے۔

صفیہ: اس صورت میں گھڑی اس کے مالک کو نہیں ملے گی۔

(اکرم گھڑی اٹھا کر دیکھتا ہے)

اکرم: پھر کیا کیا جائے؟

صفیہ: ہم گھڑی کو چھپا کر رکھیں گے جو شخص آئے گا، اس سے پوچھیں گے کہ اگر یہ آپ کی گھڑی ہے تو بتائیے یہ کیسی ہے۔ مثلاً اس کی زنجیر کیسی ہے؟

اکرم: زنجیر کہاں ہے اس کی؟

صفیہ: ہم سوال تو کر سکتے ہیں نا۔ ایسے سوالوں سے پتا چل جائے گا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے یا نہیں۔ جس نے گھڑی کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتا دیا، وہ اسی کی ہو گی۔

اکرم: گھڑی کہاں رکھیں؟

صفیہ: میز کی دراز میں رکھ دو۔

(اکرم میز کی ایک دراز کھولتا ہے۔ گھڑی اس میں رکھ کر دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اشرف اور سعید آتے ہیں)

صفیہ: اشرف! اشتہار لگا دیا؟

اشرف: ہاں! لگا دیا ہے۔ سامنے بڑی دیوار پر۔ بڑا مزہ آیا۔ جیسے ہی ہم نے اشتہار لگایا، کئی لوگ آ گئے اور پڑھنے لگے۔

سعید: (میز پر نظریں ڈالتے ہوئے) گھڑی کہاں گئی؟

اکرم: میز کی دراز میں رکھ دی ہے، جو بھی آئے گا، ہم اس سے پوچھیں گے کہ جناب! گھڑی کیسی ہے؟

سعید: ٹھیک! ٹھیک!

صفیہ: سعید! تم باہر کے دروازے پر ٹھہرو جا کر۔ جو آئے، اسے لے آؤ۔

سعید: میرے ذمے یہ ڈیوٹی ہے۔ اچھا! جاتا ہوں۔ کسی کے آنے کی آواز تو آ رہی ہے۔

اشرف: بھاگو نا پھر۔

(سعید جلدی سے نکل جاتا ہے)

صفیہ: دیکھنا میں کیسے کیسے سوال کرتی ہوں۔

اکرم: بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا۔

اشرف: کوئی آ رہا ہے۔

(ایک بوڑھا آدمی آتا ہے)

بوڑھا: (دروازے پر رک کر) اچھے بچو! میں اندر آ جاؤں؟

اشرف: آئیے آئیے! تشریف لائیے بڑے میاں!

بوڑھا: شکریہ شکریہ! عزیز بچو! یہ تم نے بہت اچھا کیا جو ایسی عبارت لکھ کر دیوار پر لگا دی۔ بہت اچھا کیا۔ اچھے بچے ہمیشہ اچھے کام کرتے ہیں۔

اکرم: جی جناب!

بوڑھا: میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں۔ ہائے کیا بتاؤں! صبح سے کتنا پریشان تھا۔ یہ گھڑی خدا جھوٹ نہ بلوائے، تیس دو بتیس اور تین پینتیس 35 برس سے میرے پاس ہے۔

اکرم: پینتیس برس سے؟

بوڑھا: ہاں بیٹا! پورے پینتیس برس سے۔ مجھے اس سے بڑی محبت ہے۔ اور محبت کی وجہ یہ ہے کہ میرے نانا جان نے مجھے دی تھی۔

اشرف: اور نانا جان کو ان کے ابا جان نے دی ہو گی؟

بوڑھا: نہیں بیٹا! میرے نانا جان نے اپنے نانا جان سے لی تھی اور انہوں نے اپنے نانا جان سے لی تھی۔

اکرم: اور انہوں نے اپنے نانا جان سے لی ہو گی۔

صفیہ: (ہنس کر) بڑے میاں! اس وقت تک تو گھڑی ایجاد ہی نہیں ہوئی ہو گی۔

بوڑھا: ارے! کیا کہتی ہو بیٹا! گھڑی تو پتھر کے زمانے میں بھی انسان کے پاس تھی۔

صفیہ: اچھا!

بوڑھا: ہاں!

صفیہ: بڑے میاں! آپ کی گھڑی ٹک ٹک بھی کیا کرتی ہے؟
بوڑھا: کبھی کرتی ہے، کبھی نہیں کرتی۔
صفیہ: ہاں! بے چاری تھک جاتی ہے۔
اشرف: غالباً یہ دنیا کی سب سے پرانی گھڑی ہے۔
بوڑھا: میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔
صفیہ: تو بڑے میاں! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اسے عجائب گھر میں رکھوا دیں؟
بوڑھا: کیا کہا؟ میری گھڑی عجائب گھر میں رکھواؤ گے؟ لا حول ولا۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آج میری پرانی گھڑی کو عجائب گھر میں رکھواؤ گے، کل کوئی کہے گا، بڑے میاں! تم بھی پرانے ہو گئے ہو۔ اب تمہیں عجائب گھر میں رکھوا دینا چاہیے۔
(بچے ہنستے ہیں)
نا بابا! میری گھڑی مجھے دو!
(بوڑھا ہاتھ بڑھاتا ہے)
صفیہ: جناب عرض یہ ہے کہ آپ نے گھڑی کی سب نشانیاں غلط بتائی ہیں۔ ہمیں آپ کی گھڑی نہیں ملی۔ آپ دروازے پر جو لڑکا کھڑا ہے، اسے اپنا پتا بتا دیں، جو فیصلہ ہو گا وہ آپ کو بتا دیا جائے گا۔
بوڑھا: بتا دیا جائے گا؟ کیا مطلب؟
(سعید آتا ہے)
سعید: دو صاحب اور آئے ہیں۔
صفیہ: اچھا بڑے میاں! خدا حافظ!
بوڑھا: بھئی کمال ہے۔ آج کل کے بچے کتنے گستاخ ہو گئے ہیں۔ توبہ توبہ!
(بوڑھا جانے لگتا ہے۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی آتا ہے)
اشرف: آئیے جناب!
آدمی: آ رہا ہوں بچو! گھڑی دو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔
اکرم: کہاں سے دیر ہو گئی ہے؟
آدمی: کیا پوچھتے ہو۔ مجھے گیارہ بجے ایک بہت ضروری کام پر جانا تھا۔ گھڑی گم ہو جانے کی وجہ سے وقت کا اندازہ غلط ہوا۔ لاؤ نا میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی کرو جلدی!
اشرف: مگر جناب! یہ تو بتائیے کہ۔۔۔۔
آدمی: میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ کچھ بتاؤں۔ پوچھو! میرے بارے میں کیا پوچھنا چاہتے ہو۔
صفیہ: جناب! آپ کے بارے میں نہیں۔ آپ کی گھڑی کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔ کیسی ہے آپ کی گھڑی؟
آدمی: کیسی ہے گھڑی؟ ویسی ہی جیسی اسے ہونا چاہیے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ وہی اس کے پرزے ہیں۔ اتنا ہی اس کا وزن ہے، جتنا عام گھڑیوں کا ہوتا ہے۔
صفیہ: اور زنجیر بھی ویسی ہی ہے؟
آدمی: کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ زنجیر بھی ویسی ہی ہے۔
(صفیہ ہنس پڑتی ہے)
صفیہ: معاف کیجئے جناب! ہمیں جو گھڑی ملی ہے، اس کی زنجیر تو ہے ہی نہیں۔
آدمی: ارے! زنجیر کس نے اڑا لی؟ خدا بھلا کرے اس کا۔ اچھا! نئی زنجیر خریدنا پڑے گی۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ نکالو۔ نکالو۔ اوہو! کیا کھڑے سوچ رہے ہو؟ میں کہتا ہوں، میری گھڑی لاؤ۔ شاباش شاباش! ہیں یہ کیا؟ یہ کیا تماشا ہے؟ سنتے نہیں ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں؟
صفیہ: ہم سن رہے ہیں جناب!
آدمی: تو پھر بات کیا ہے؟ معاملہ کیا ہے؟ کیا قصہ ہے؟ گھڑی کا مالک آیا ہے۔
صفیہ: یہی تو مصیبت ہے جناب!
آدمی: مصیبت؟ کیا مصیبت ہے؟
صفیہ: گھڑی کا مالک نہیں آیا ہے۔
آدمی: تو میں کیا ہوں؟

صفیہ: آپ--- یعنی کہ آپ ہیں۔
آدمی: یعنی کہ میں ____ میں ہوں۔
صفیہ: اور گھڑی گھڑی ہے۔
آدمی: کیا مہمل باتیں ہیں؟ گھڑی دو ورنہ میں تھانے میں رپورٹ درج کرا دوں گا۔ سنا تم نے؟ نہیں سنا؟
اشرف: سن لیا ہے۔
آدمی: تو اب نہیں دو گے؟
صفیہ: جی نہیں۔ اس لیے کہ یہ گھڑی آپ کی نہیں ہے۔
آدمی: تو مجھے تھانے جانا پڑے گا۔ ابھی جاتا ہوں۔ اسی وقت اسی گھڑی۔ شریر کہیں کے۔ شرارت کے پتُلے۔
(آدمی تیزی سے نکل جاتا ہے۔ بچے زور سے ہنستے ہیں۔ ایک اور آدمی آتا ہے، ادھیڑ عمر کا۔ دروازے پر آ کر رک جاتا ہے)
صفیہ: آئیے جناب۔
(آدمی وہیں کھڑا رہتا ہے)
اشرف: آئیے جی!
(آدمی اب بھی وہیں کھڑا رہتا ہے)
صفیہ: جناب! آپ تشریف کیوں نہیں لاتے؟
(آدمی آہستہ آہستہ آنے لگتا ہے)
آدمی: (غصے سے) کیا بدتمیزی ہے۔ میں دروازے پر کھڑا ہوں اور اندر آنے کے لیے کہتے ہی نہیں۔
صفیہ: جناب! ہم نے تو آپ کو بلایا تھا۔
آدمی: کیا کہا؟
صفیہ: ہم نے کہا تھا آئیے جی!
آدمی: میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔
صفیہ: اچھا! تو یہ بات ہے (بلند آواز میں) فرمائیے جناب!
آدمی: میں کچھ فرمانے کے لیے نہیں آیا۔
اشرف: تو ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں؟
آدمی: کیا کہہ رہے ہو؟
صفیہ: (بلند آواز) جناب! ہم عرض کرتے ہیں کہ کیا خدمت کر سکتے ہیں؟
آدمی: خدمت یہی کر سکتے ہو کہ میری گھڑی مجھے دے دو۔
صفیہ: بہت اچھا جناب!
آدمی: شابش! شابیش! شابوش!
صفیہ: یہ گھڑی ہے کیسی؟
آدمی: کیا؟
صفیہ: (بلند آواز) یہ بتایئے گھڑی کیسی ہے؟
آدمی: بھئ میرا حافظہ اتنا کمزور ہے کہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ رات کھایا کیا تھا۔ اور تم پوچھ رہے ہو کہ بتاؤں گھڑی کیسی ہے؟
صفیہ: (بلند آواز) تو حضور کو یہ کیوں کر یاد آیا کہ آپ کی گھڑی گم ہو گئی ہے؟
آدمی: یہ معاملہ بھولنے والا نہیں ہے۔
اشرف: مگر اب بھول ہی جائیے۔
آدمی کیا بھول جاؤں؟
اشرف: کہ آپ کی گھڑی گم ہو گئی ہے۔
صفیہ: بھولنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ گھڑی گم ہوئی ہی نہیں۔
آدمی: اس کا مطلب ہے کہ مجھے تمہارے ابا جان سے ملنا پڑے گا۔ ابھی ملتا ہوں۔
(زمین پر زور زور سے پاؤں مار کر چلا جاتا ہے۔ ایک آدمی اور آ جاتا ہے)
صفیہ: آئیے جناب!
نیا آدمی: واہ وا! یہاں تو ایک چھوڑ تین بچے جمع ہیں۔ مجھے بچوں سے بڑی محبت ہے۔ اور بچوں کو بھی مجھ سے محبت ہے۔

آپ مجھے جانتے نہیں؟
صفیہ: جی نہیں۔
نیا آدمی: ہیں! مجھے نہیں جانتے؟ کبھی میری آواز سنی نہیں؟ (خاص انداز میں) چنا جور گرم، میں لایا چنا جور گرم،
(تینوں بچے گاتے ہیں)
چنا جور گرم۔ میں لایا مزے دار چنا جور گرم۔
(وہ آدمی بھی اپنی آواز ان کی آواز میں شامل کر دیتا ہے۔ کئی لمحے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے)
نیا آدمی: بس بھئی بس! اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میری گھڑی گری کس طرح؟
صفیہ: گر پڑی تھی؟
نیا آدمی: ہاں بیٹی! ہوا یوں کہ میں تمہاری گلی میں آیا تو ایک کتا میرے پیچھے بھاگا۔ میں بھی بھاگا۔
صفیہ: پھر کیا ہوا؟
نیا آدمی: وہ میرے پیچھے بھاگ رہا تھا اور میں اس کے آگے۔
اشرف: اس کے بعد کیا ہوا؟
نیا آدمی: وہ تیزی سے بھاگنے لگا اور میں بھی تیزی سے بھاگنے لگا۔
اشرف: دونوں بھاگتے رہے؟
نیا آدمی: دونوں بھاگتے رہے۔ وہ جتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا، اتنی ہی تیزی سے میں بھی بھاگ رہا تھا۔
صفیہ: اس طرح تو آپ کئی میل دوڑتے چلے گئے ہوں گے۔
نیا آدمی: اور کیا۔ وہاں ایک بڑی سی نالی آئی۔ میں اسے پھلانگنے لگا تو گھڑی وہیں گر پڑی اور میں ایک دوسرے راستے سے لوٹ آیا۔
اشرف: تو یہ ہے آپ کی گھڑی گم ہونے کی داستان!
نیا آدمی: ہاں بیٹا!
صفیہ: مگر آپ کی گھڑی تو میلوں دور ایک نالی کے پاس گری تھی اور یہ تو ہمیں اسی گلی میں ملی ہے۔
نیا آدمی: نہیں۔
(بچے ہنس پڑتے ہیں۔ وہ آدمی جانے لگتا ہے۔ بچے ہنس ہی رہے ہیں کہ امی اندر آتی ہیں)
امی: یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ہنس کیوں رہے ہو؟
اشرف: امی! بڑے مزے دار قصہ ہے۔ ابھی آپ کو سنائیں گے۔
امی: قصہ بعد میں سنانا۔ ننھا ضد کر کے بچوں کی بناوٹی گھڑی لے آیا تھا، بارہ پیسے کی کھیلتے کھیلتے کہیں گم کر بیٹھا ہے۔ ذرا گلی میں جا کر ڈھونڈو۔ رو رہا ہے۔
صفیہ: کیا کہا امی؟ وہ گھڑی ننھے کی ہے؟
امی: کہاں ہے؟
صفیہ: (دراز میں سے گھڑی نکال کر) یہ تو نہیں؟
امی: ہاں! یہی تو ہے۔
(سعید بھاگتا ہوا اندر آتا ہے)
سعید: چار آدمی اور آئے ہیں۔
صفیہ: ہیں! چار آدمی اور آئے ہیں؟ (زور زور سے ہنستے ہوئے) امی!
امی: کیا ہے؟
صفیہ: آپ نے چھوٹوں کو تو بتا دیا کہ ایمان داری سے کام لیں۔ مگر بڑوں کو یہ بات کون سمجھائے؟
امی: کیا مطلب؟
(بچے ہنستے ہیں۔ امی انہیں گھور گھور کر دیکھتی ہیں۔ پردہ گرتا ہے)
***

وہ لڑکی کون تھی؟

پہلا منظر

(ایک کمرا۔ ثریا صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ جاوید آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک رو مال ہے۔ جس میں اس نے ایک تتلی کو چھپا رکھا ہے)

جاوید: ثریا!
ثریا: کیا ہے جاوید!
جاوید: کچھ نہیں۔
ثریا: رو مال میں کیا ہے؟ بھلا ہم دیکھ نہیں سکتے؟
جاوید: رو مال میں کچھ نہیں ہے۔
ثریا: کچھ نہیں ہے چھپا کیوں رہے ہو؟ دکھاؤ نا بھیا!
جاوید: نہیں دکھاتے۔
ثریا: (روٹھنے والے انداز میں) اچھا! نہ دکھاؤ۔ نہیں دیکھتے ہم بھی۔
(ثریا جانے لگتی ہے)
جاوید: ٹھہرو! دکھاتا ہوں۔
(ثریا لوٹ آتی ہے)
ثریا: دکھاؤ۔
جاوید: ایسی شے ہے کہ دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔
ثریا: ہوں اُوں۔
جاوید: ہاں اور کیا۔ ذرا سی شے ہے اور اتنے رنگ ہیں اس میں کہ کوئی شمار ہی نہیں کر سکتا۔
ثریا: (شوق سے) کیا ہے وہ؟
جاوید: تم نے پھولوں والی کتاب دیکھی ہے نا؟ لال جلدی والی؟ ابا کی الماری میں رکھی ہوئی ہے۔
ثریا: سمجھی! پھول ہے کوئی۔
جاوید: پھول میں نے شمار رنگ ہوتے ہیں کیا؟
ثریا: باغ سے لائے ہو؟
جاوید: باغ میں صرف پھول ہی ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا؟
(جاوید رو مال کھول کر ثریا کو تتلی دکھاتا ہے)
ثریا: ہائے میرے اللہ! کتنی پیاری ہے!
جاوید: دوں گا نہیں۔
ثریا: کہاں رکھو گے؟
جاوید: کتاب کے اندر۔
ثریا: ہائے! مر جائے گی بے چاری! نہ بھیا! کتاب کے اندر تو بالکل نہ رکھنا۔
جاوید: باہر ہی رہی تو اڑ جائے گی۔ تمہیں کیا خبر کتنی مشکل سے پکڑی ہے۔
ثریا: ڈرائینگ روم میں جو گل دان ہے نا، وہاں بٹھا دو۔
جاوید: وہاں سے تو اڑ جائے گی۔ فوراً اڑ جائے گی۔
ثریا: تو تو۔۔ ۔ بتاؤں بھیا؟ صحن میں چھوڑ دو۔ یا یوں کرو کہ یہیں چھوڑ دو۔
جاوید: چھوڑوں گا تو ہرگز نہیں۔
(باجی کمرے کے اندر آتی ہے)
باجی: کیا نہیں چھوڑو گے جاوید!
ثریا: جاوی بھیا بڑی خوب صورت تتلی پکڑ کر لائے ہیں۔
باجی: پکڑ کر کیوں لائے ہو؟
جاوید: میں تو ایک بڑا سا گلاب کا پھول توڑنے گیا تھا اور---- یہ اڑ رہی تھی وہاں۔ پکڑ لی میں نے۔
باجی: اچھا نہیں کیا جاوی تم نے۔
ثریا: اور اب کہتے ہیں کہ کتاب کے اندر رکھوں گا۔ باجی! مر جائے گی نا بے چاری؟

باجی: اور کیا ہو گا۔
جاوید: امجد نے بھی ایک تتلی پکڑ کر کتاب کے اندر رکھی ہے اور اب سب کو دکھاتا رہتا ہے۔
باجی: جاوی! چھوڑ دو اسے۔ تمہیں کیا پتا اسے پھول سے کتنی محبت ہے۔ تم اسے پکڑ لائے ہو۔ کیا اس میں تمہاری طرح جان نہیں ہے؟
ثریا: میں نے تو کہا ہے، چھوڑ دو اسے۔
باجی: اگر تمہیں کوئی اس طرح پکڑ کر بند کر دے تو کیا حال ہو گا تمہارا؟
جاوید: اچھا باجی!
باجی: چھوڑ دو گے نا؟
جاوید: ہاں!
(باجی چلی جاتی ہیں)
ثریا: کہاں چھوڑو گے؟
جاوید: یہیں۔
ثریا: نہیں بھیا! باہر چھوڑ دو جا کر۔ مجھے دو۔ میں چھوڑ آوں گی، باغ کے پاس جا کر۔ وہاں سے چلی جائے گی باغ میں۔ ٹھیک ہے نا بھیا؟
جاوید: یہیں چھوڑوں گا اور دروازہ بند کر دوں گا۔
ثریا: وہ کیوں؟ یہ تو ہی قید ہوئی نا؟
جاوید: تمہیں پتا نہیں۔ شام کو جب روشنی ہو گی تو اس کے چمکتے دمکتے پَر کتنے بھلے معلوم ہوں گے۔ صبح کو ضرور چھوڑ دوں گا۔
ثریا: تو ابھی روشنی کر کے دیکھ لو۔
جاوید: نہیں۔ بلب کی روشنی میں تو کمال ہو جائے گا۔ روشنی میں اڑے گی تو اس کے رنگین پر چمکیں گے۔ عجیب نظارہ ہو گا۔ دیکھنا لطف آ جائے گا۔
**

دوسرا منظر

(وہی کمرا۔ جاوید کمرے کے اندر آتا ہے)

جاوید: ثریا!
(کئی لمحے گزر جاتے ہیں۔ ثریا نہیں آتی۔ ایک لڑکی جس نے نہایت خوب صورت رنگین کپڑے پہن رکھے ہیں، کمرے کے ایک کونے میں سے آگے آتی ہے)
لڑکی: آپ کسے تلاش کر رہے ہیں؟
جاوید: آپ کون ہیں؟
لڑکی: آپ تتلی کو ڈھونڈ رہے ہیں نا؟
جاوید: مگر آپ۔۔؟
لڑکی: اس تتلی کو آپ باغ سے پکڑ کر لائے ہیں اور اب روشنی میں اس کے پَر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی بات ہے نا جناب!
جاوید: ہاں!
لڑکی: ایک بات بتایئے۔ اگر کوئی شخص آپ کو پکڑ کر کہیں لے جائے اور کہے کہ پانی میں جا کر ناچو تو؟
جاوید: تم یہ کیوں پوچھتی ہو مجھ سے؟
لڑکی: اس لیے کہ میں ہی وہ تتلی ہوں۔
جاوید: تم تتلی!
لڑکی: میں نے اللہ میاں سے دعا کی تھی کہ اللہ پاک مجھے ذرا دیر کے لیے لڑکی بنا دے اور میں لڑکی بن گئی۔

جاوید: تم سچ مچ---- --
لڑکی: کہہ تو رہی ہوں کہ میں وہی تتلی ہوں۔ جسے حضور پکڑ کر لائے ہیں۔
جاوید: اچھا! پھر؟
لڑکی: پھر، میرے سوال کا جواب دو۔
جاوید: کیا پوچھا تھا تم نے؟
لڑکی: اگر کوئی آپ کو پکڑ کر لے جائے تو آپ کا کیا حال ہو گا؟
جاوید: مجھے کوئی پکڑے گا بھلا؟
لڑکی: کیوں؟ آپ کو کوئی کیوں نہیں پکڑے گا؟ کیا آپ نے مجھے نہیں پکڑا تھا؟
جاوید: میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔
لڑکی: میں بھی تو یہاں آنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ پکڑ کر لے آئے۔ خبر ہے کتنی تکلیف ہوئی ہے مجھے؟ میں اڑنے والی تتلی۔ آپ نے ایک رو مال میں مجھے قید کر لیا آپ کو خبر ہی نہیں ہو گی کہ میرے ایک بازو میں درد ہو رہا ہے۔ آپ کا بازو کوئی اس طرح زور زور سے ہلائے تو آپ درد سے چیخ اٹھیں گے مگر بے چاری تتلی کی آپ کو کیا پروا ہے۔ اس کا بازو بے شک ٹوٹ جائے۔ آپ کو تو ذرہ بھر تکلیف نہ ہو گی۔
جاوید: اوہو!
لڑکی: اوہو سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کتنے ظالم ہیں۔ مجھے اپنے پھول سے اتنی محبت ہے کہ کیا کہوں۔
جاوید: میں تو پھول ہی توڑنا چاہتا تھا۔
لڑکی: میں آپ کے سامنے نہ آ جاتی تو آپ پھول توڑ ہی لیتے۔
جاوید: تو تم کیوں آ گئی تھیں سامنے؟
لڑکی: اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے؟ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ میرا پیارا پھول کوئی توڑ کر لے جائے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم مجھے پکڑ لو گے اور پھول کا خیال چھوڑ دو گے۔
جاوید: تم نے پھول کے لیے قربانی دی ہے۔
لڑکی: اسی قربانی کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے میری دعا قبول کر لی ہے۔
جاوید: مجھے اس کا افسوس ہے!
لڑکی: تم لوگ سمجھتے ہو کہ بس جان تم ہی میں ہوتی ہے۔ تکلیف صرف انسان ہی کو ہو سکتی ہے اور سب مردہ ہیں۔ حالاں کہ جس طرح انسان کو تکلیف ہوتی ہے، ہمیں بھی ہوتی ہے۔ پھولوں اور درختوں کو بھی ہوتی ہے۔
جاوید: اچھا!
لڑکی: بعض شریر بچے اپنے کھلونوں کو غصے میں پھینک دیتے ہیں۔ کسی گڑیا کا بازو ٹوٹ جاتا ہے تو کسی طوطے کی آنکھ جاتی رہتی ہے اور کسی بلی کی ٹانگ ہی الگ ہو جاتی ہے۔ ان سب کو تکلیف ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ تم انسانوں کے آنسو تو دیکھ سکتے ہو، ان کے آنسو تمہیں نظر نہیں آتے۔
جاوید: مگر یہ تو بے جان ہوتے ہیں۔
لڑکی: بے جان کہاں ہوتے ہیں۔ اگر تم پھول پر آہستہ سے اپنی انگی پھیرو تو تمہیں نمی کا احساس ہو جائے گا۔ یہ پھول کے آنسوؤں کی نمی ہے۔
جاوید: اچھا!
لڑکی: یاد کرو! کبھی تمہارے دوست نے تمہارا ہاتھ زور سے دبایا ہو گا تو تم ضرور چیخ اٹھے ہو گے۔
جاوید: درد جو ہوتا ہے!
لڑکی: اسی طرح ہمیں بھی درد ہوتا ہے۔ ہم بھی چیختے ہیں، چلاتے ہیں، تڑپتے ہیں، روتے ہیں۔
جاوید: مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔
لڑکی: خاک افسوس ہے۔ توبہ! کتنی زور سے میرا بازو دبایا تھا تم نے۔ اور پھر مجھے کتاب میں بند کر کے مار ڈالنا چاہتے تھے توبہ! توبہ!
جاوید: میرے ایک دوست نے----
لڑکی: تمہارا دوست بڑا ظالم ہے، بے درد ہے۔
جاوید: میں اب ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔
لڑکی: شکر ہے، تم سمجھ گئے ہو۔

جاوید: اب میں کیا کروں؟
لڑکی: مجھے آزاد کر دو۔
جاوید: لیکن تم تو تتلی نہیں؟
لڑکی: تتلی ہی تو ہوں۔
جاوید: پھر تتلی بن جاؤ گی؟
لڑکی: اور کیا۔ کیا خبر راستے ہی میں بن جاؤں۔
جاوید: باغ میں چلی جاؤ گی؟
لڑکی: کیوں نہیں۔
جاوید: اچھا خدا حافظ!
(جاوید کمرے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ لڑکی نکل جاتی ہے۔ باجی اندر آتی ہے)
باجی: جاوی! یہ ثریا کیا کہتی ہے؟
ثریا: پوچھ لو باجی! یہ کہتے تھے کہ بلب کی روشنی میں تتلی کے چمکتے ہوئے پَر دیکھیں گے۔
باجی: کیوں جاوی؟۔۔۔ بولتے کیوں نہیں؟
جاوید: باجی!
باجی: ارے! تم رو رہے ہو!
جاوید: باجی! میں نے بڑی غلطی کی جو تتلی کو پکڑ لیا۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔
باجی: یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مگر تم پشیمان کیوں ہو؟
جاوید: وہ لڑکی جو آئی تھی۔
باجی: کون تھی وہ لڑکی؟
جاوید: وہی تو تھی۔۔ ۔ وہی تو تتلی تھی۔
(جاوید رو رہا ہے۔ باجی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں۔ پردہ گرتا ہے)
***

اِنصاف

پہلا منظر

(اندلس کا شاہی محل۔ ایک خاص کمرا۔ صبح کا وقت۔ ہسپانیہ کا بادشاہ حَکَم کسی سوچ میں غرق آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ کمرے کے آخری گوشے میں پہنچ کر وہ تین لمحوں کے لیے رکتا ہے اور پھر واپس آنے لگتا ہے۔ خادم آتا ہے۔ حَکَم کی اس پر نظر نہیں پڑی۔ خادم اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ وہ کب دیکھے اور وہ کچھ عرض کرے۔ حَکَم اس کی طرف دیکھتا ہے اور رک جاتا ہے)

حَکَم: کیوں۔۔ یوسف؟ کیا بات ہے؟
خادم: حضور! وزیر اعظم حاضر ہونا چاہتے ہیں۔
حَکَم: بلاؤ!
(خادم کمرے سے نکل جاتا ہے۔ وزیر اعظم دروازے پر آتا ہے اور ادب سے سر جھکا کر السلام علیکم حضور! کہتا ہے۔ اس کے جواب میں حَکَم وعلیکم السلام کہہ کر سر کے اشارے سے اندر آنے کے لیے کہتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لپٹا ہوا ایک کاغذ نظر آتا ہے)
حَکَم: بہت اچھا ہوا کہ تم خود آ گئے۔
وزیر اعظم: حضور! کیا ارشاد ہے؟
حَکَم: ہم اس نئے محل کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ یہ محل ایسا خوب صورت بنے کہ لوگ دور دور سے آ

کر اسے دیکھیں۔ اگر اس جیسا دوسرا محل نہ ہو تو کم از کم یہ اتنا شان دار ضرور ہو کہ ارد گرد کے سارے محل اس کے سامنے ہیچ دکھائی دیں۔
وزیر اعظم: انشاء اللہ نیا محل اپنی مثال آپ ہو گا۔
حَکَم: خدا کرے ایسا ہی ہو۔
وزیر اعظم: محل کا نقشہ مکمل ہو گیا ہے۔
حَکَم: مکمل ہو گیا ہے؟ لے آئے ہو؟
وزیر اعظم: ہاں حضور! ملاحظہ کیجئے۔ (وزیر اعظم کاغذ کھول کر حَکَم کے سامنے پھیلا دیتا ہے)
حضور! مجھے یقین ہے کہ جب یہ عمارت اس نقشے کے مطابق تیار ہو جائے گی تو لوگ پچھلی تمام خوب صورت عمارتوں کو بھول جائیں گے۔
حَکَم: نقشہ تو ہماری امید کے مطابق ہے۔
وزیر اعظم: عالی جاہ! محل بھی آپ کی امید کے مطابق ہو گا۔
حَکَم: مگر۔۔ ۔
وزیر اعظم: ارشاد حضور!
حَکَم: (نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے) یہ جگہ شاید بڑھیا کی ہے، جہاں اس نے اپنا مکان بنا رکھا ہے۔
وزیر اعظم: آپ نے درست فرمایا۔ یہ وہی جگہ ہے۔
حَکَم: ہم نے کہا تھا کہ بڑھیا کو اس مکان کی پوری پوری قیمت ادا کر دی جائے، تاکہ اسے یہ شکایت نہ ہو کہ ہسپانیہ کے حکم راں نے اپنے محل کے لیے میری زمین چھین لی ہے۔
وزیر اعظم: حضور! میں اس کا انتظام کر چکا ہوں اپنے ایک خاص آدمی کو بڑھیا کے پاس بھیجا ہے کہ اس سے اس معاملے میں بات کرے اور جو کچھ نتیجہ نکلے، وہ ہمیں بتا دے۔ بڑھیا کو قیمت وصول کرنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ تو بہت خوش ہو گی کہ اس کی منھ مانگی قیمت مل رہی ہے اور کیا چاہیے اسے؟
حَکَم: ہم چاہتے ہیں کہ بڑھیا جو کچھ مانگے۔ اس سے زیادہ اسے دیا جائے۔
وزیر اعظم: میں حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے خادموں سے کہہ آیا تھا کہ جیسے ہی وہ لوٹے اسے محل میں بھیج دیا جائے۔
حَکَم: یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ ہم خود سننا چاہتے ہیں کہ بڑھیا نے اپنی زمین کی کیا قیمت طلب کی ہے۔
(خادم آتا ہے)
خادم: حضور! ایک صاحب اسی وقت وزیر اعظم سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں، بہت ضروری کام ہے۔
وزیر اعظم: وہی شخص معلوم ہوتا ہے حضور!
حَکَم: (خادم سے) بھیج دو۔
(خادم کمرے سے نکل جاتا ہے۔ حَکَم اور وزیر اعظم دونوں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایک شخص آتا ہے۔ اندر آ کر ادب سے سر جھکاتا ہے)
حَکَم: بڑھیا سے بات کی؟ کیا فیصلہ ہوا؟
وہ شخص: حضور! میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ میں اپنے مقصد میں کام یاب نہیں ہو سکا۔
حَکَم: کیوں؟ کیا بڑھیا بہت زیادہ قیمت طلب کرتی ہے؟
وہ شخص: نہیں حضور!
حَکَم: ہمارا حکم ہے کہ بڑھیا جتنی قیمت بھی مانگے فوراً ادا کر دی جائے۔
وہ شخص: حضور! مشکل یہ ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی رضا مند نہیں ہوتی۔
وزیر اعظم: تم نے اس سے کہا نہیں تھا کہ محل کے لیے یہ زمین بہت ضروری ہے۔
وہ شخص: میں نے اسے یہ بات سمجھائی دی تھی۔
وزیر اعظم: کیا کہا اسے نے؟
وہ شخص: کہنے لگی، یہ زمین میرے بزرگوں کی ہے اور مجھے بہت عزیز ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی اسے فروخت نہیں کر سکتی۔
حَکَم: شاید اس کا خیال ہے کہ جتنی قیمت چاہتی ہے۔ اتنی اسے نہیں مل سکے گی۔
وہ شخص: میں عرض کرتا ہوں حضور! وہ اپنی زمین کسی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

وزیر اعظم: وہ تو ایک غریب بڑھیا ہے کیا اسے روپے کی ضرورت نہیں ہے؟
وہ شخص: حیرت اسی بات پر ہے کہ وہ غریب ہونے کے باوجود کہتی ہے کہ اگر دس گنا قیمت بھی دی جائے جب بھی میں یہ زمین فروخت نہیں کروں گی۔
وزیر اعظم: اس کا یہی ارادہ ہے؟
وہ شخص: میں بالکل درست عرض کر رہا ہوں۔ میں نے یہاں تک کہا کہ اگر تم نے اپنی ضد جاری رکھی تو نقصان اٹھاؤ گی۔ اس پر بھی وہ راضی نہیں ہوئی۔ حضور! مجھے یقین ہے کہ وہ کسی طرح بھی زمین بیچنے پر راضی نہیں ہو گی۔
حَکَم: کہتی کیا ہے؟
وہ شخص: کہتی ہے کہ میں اپنی زمین نہیں بیچوں گی۔
حَکَم: اس سے کہو کہ ہم دس گنا نہیں، بیس گنا قیمت ادا کریں گے۔
وہ شخص: حضور! معاف کیجئے۔ جس بڑھیا سے میں گفتگو کر کے آ رہا ہوں، وہ بے حد ضدی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا کوئی لالچ بھی اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔
وزیر اعظم: یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔
وہ شخص: آپ خود بات چیت کر کے دیکھ لیں۔
حَکَم: یہ تو بڑی مشکل ہے۔ بڑھیا کی رضا مندی کے بغیر اس کی زمین محل میں شامل نہیں کی جا سکتی۔ ہاں ایک صورت اور بھی ہے۔
وزیر اعظم: وہ کیا صورت ہے جہاں پناہ؟
حَکَم: بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیائے۔ اگر تھوڑی سی زمین محل میں شامل نہ ہو تو اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟
وزیر اعظم: گستاخی معاف حضور! اگر اس زمین کو الگ کر دیا گیا تو محل کا ایک حصہ ٹیڑھا ہو جائے گا اور اس ایک خرابی سے محل کی ساری شان خاک میں مل جائے گی۔
حَکَم: ہاں! تم درست کہتے ہو۔ مگر اب کیا کیا جائے؟ بڑھیا کو کس طرح راضی کیا جائے؟
وزیر اعظم: میں خود اس کے پاس جاتا ہوں۔ اس کی کیا مجال جو نہ مانے۔
وہ شخص: میں ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔
حَکَم: کہو!
وہ شخص: یہ سوچ لیجئے کہ اگر بڑھیا نے وزیر اعظم کی بات بھی نہ مانی تو پھر کیا ہو گا؟
وزیر اعظم: کیا معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے؟
وہ شخص: جی ہاں!
وزیر اعظم: اگر بڑھیا پاگل پن سے باز نہ آئی تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جائے گا کہ زبردستی اس کی زمین پر قبضہ کر لیا جائے اور مناسب قیمت اسے دے دی جائے۔
حَکَم: نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔
وہ شخص: وہ نہیں مانے گی۔
وزیر اعظم: یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے عالی جاہ!
حَکَم: کوشش یہی کرنا کہ وہ کسی نہ کسی قیمت پر مان جائے اور زبردستی کرنے کی نوبت نہ آئے۔
وزیر اعظم: بہتر حضور!
حَکَم: ہماری طرف سے تمہیں اختیار ہے کہ جتنی قیمت چاہو مقرر کر لو۔
وزیر اعظم: میں ابھی بڑھیا کے پاس جاتا ہوں۔
حَکَم: جاؤ!
(حَکَم یہ کہہ کر ایک طرف کو جانے لگتا ہے۔ اس کے قدم اٹھاتے ہی پردہ گرتا ہے)
**

دوسرا منظر

(اندلس کے قاضی کی عدالت۔ قاضی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ آگے میز پر بہت سے کاغذ پڑے ہیں۔ کچھ فاصلے پر اہل کار کھڑا ہے)

قاضی: کیا آج کے سارے مقدمے ختم ہو گئے۔
اہل کار: سارے مقدمے ختم ہو گئے ہیں جناب عالی!
قاضی: باہر جا کر دیکھو! کوئی ہے تو نہیں؟
اہل کار: جناب! میں ابھی ابھی باہر دیکھ آیا ہوں۔
قاضی: ایک مرتبہ اور جاؤ!
اہل کار: بہت بہتر جناب!
(اہل کار باہر چلا جاتا ہے اور چند لمحوں بعد واپس آتا ہے)
قاضی: کیوں؟ کوئی ہے؟
اہل کار: جناب اور تو کوئی نہیں ہے، ایک بڑھیا ہے جو آپ سے ملنا چاہتی ہے۔
قاضی: بلا لاؤ!
اہل کار: بہتر!
(اہل کار باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ایک بڑھیا آ جاتی ہے)
قاضی: آؤ اماں!
بڑھیا: کیا میں اُندلُس کے سب سے بڑے قاضی کی خدمت میں حاضر ہوں؟
قاضی: تم انصاف کے ایک خدمت گزار کے پاس آئی ہو۔
بڑھیا: میں انصاف کے دروازے پر دستک دینے آئی ہوں۔
قاضی: اس دروازے پر دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔
بڑھیا: میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ آج یہ دروازہ بند ہو جائے گا۔
قاضی: اگر ایسا سمجھتی ہو تو میرے پاس آئی کیوں ہو؟
بڑھیا: قاضی صاحب! معاف کیجئے۔ یہ بات میں نے اس وجہ سے کہی ہے کہ آج جس شخص کے خلاف میں انصاف طلب کرنے آئی ہوں، وہ جب چاہے انصاف کا دروازہ کھول بھی سکتا ہے اور بند بھی کر سکتا ہے۔ اسی دروازے پر نہیں، اس ملک کے ہر دروازے پر اسے پورا پورا اختیار ہے۔
قاضی: انصاف کا دروازہ اس عدالت میں ہے اور یہاں کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔
بڑھیا: خود بادشاہ کی بھی نہیں؟
قاضی: بادشاہ کا حکم ہر جگہ چل سکتا ہے مگر یہاں نہیں۔ کہو! کیا کہنا چاہتی ہو؟
بڑھیا: قاضی جی! میں بادشاہ کے حکم کے خلاف فریاد لے کر آئی ہوں۔
قاضی: کیا شکایت ہے تمہیں؟
بڑھیا: بادشاہ نیا محل بنوانا چاہتے ہیں۔
قاضی: تمہاری شکایت کا اس محل سے کیا تعلق ہے؟
بڑھیا: جناب! وہ جس جگہ محل بنوانا چاہتے ہیں، اس کے ایک گوشے میں میری زمین بھی ہے میں یہ زمین محل میں شامل نہیں کر سکتی۔
قاضی: کیا بادشاہ نے اس کی قیمت ادا کرنے سے انکار کیا ہے؟
بڑھیا: جی نہیں۔ وہ تو مجھے زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر بھی رضامند ہیں۔
قاضی: پھر شکایت کیا ہے؟
بڑھیا: میں زمین بیچ نہیں سکتی۔
قاضی: جب تمہیں بڑی سے بڑی قیمت مل رہی ہے تو پھر زمین فروخت کرنے سے انکار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ تمہیں شکایت اس وقت ہو سکتی تھی جب بادشاہ پوری قیمت ادا کرنے سے انکار کرتے یا تم یہ قیمت مناسب نہ سمجھتیں۔
بڑھیا: قاضی صاحب! میں سمجھتی تھی کہ ہمارا قاضی انصاف کے معاملے میں بادشاہ سے بے نیاز ہوتا ہے، مگر آج میرا یہ یقین غلط نکلا۔ سچ ہے کہاں اتنا بڑا بادشاہ اور کہاں ایک معمولی بڑھیا معاف کیجئے قاضی صاحب! میں نے آپ کو تکلیف دی۔
(بڑھیا دروازے کی طرف مڑتی ہے)
قاضی: اماں!

(بڑھیا قاضی کی آواز پر رک جاتی ہے)
بڑھیا: جی!
قاضی: کیا تم ارادہ کر چکی ہو کہ کسی قیمت پر بھی اپنی زمین نہیں بیچو گی؟
بڑھیا: اگر مجھے بادشاہ اپنا سارا خزانہ بھی دے دے جب بھی میں یہ زمین نہیں بیچوں گی۔
قاضی: ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔
بڑھیا: ایک مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ بھی یہی کہوں گی۔
قاضی: تو اماں! فکر مت کرو۔ تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔
بڑھیا: کب کیا جائے گا؟ آج وزیر اعظم آیا تھا میرے انکار پر اس نے کہا کہ شاہی محل کی عمارت کو نہیں بگاڑا جا سکتا۔ میری زمین زبردستی شاہی محل میں شامل کی جائے گی۔
قاضی: شامل ہو جانے دو!
بڑھیا: جب زمین میرے ہاتھ سے نکل گئی، اس وقت میں کیا کر سکوں گی؟
قاضی: تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے جو کچھ کرنا ہے مجھ کو کرنا ہے۔
بڑھیا: مگر قاضی جی۔
قاضی: (ہاتھ اٹھا کر بڑھیا کو اطمینان دلاتے ہوئے) یہ کام میرا ہے اور میں جانتا ہوں کہ مجھے اپنا کام کس طرح کرنا چاہیے۔ گھر جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ محل تعمیر ہونے دو۔ بالکل خاموش رہو۔
بڑھیا: جیسا آپ کا ارشاد، لیکن مجھے اطمینان کس طرح ہو گا؟
قاضی: اللہ پر بھروسہ رکھو۔
بڑھیا: میں خاموش رہوں؟
قاضی: بالکل!
بڑھیا: تو آج ہی میں اپنے ایک عزیز کے ہاں چلی جاتی ہوں۔
قاضی: جب تک بادشاہ تمہیں نہیں بلوائے، دربار میں یا محل میں نہ جانا۔
بڑھیا: میں نے کہہ دیا ہے کہ میں صبر کے ساتھ محل کو تعمیر ہوتے ہوئے دیکھوں گی اور کسی سے اس معاملے میں ایک لفظ تک نہ کہوں گی۔
قاضی: یہی میں چاہتا ہوں۔
(قاضی اٹھنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے)
**

تیسرا منظر

(بادشاہ حکم کے نئے محل کا باغ۔ قاضی تنہا ایک جگہ کھڑا ہے اور اس کے سامنے ایک بڑا سا تھیلا زمین پر پڑا ہے۔ حکم اور وزیر اعظم آتے ہیں۔ بادشاہ بہت خوش دکھائی دے رہا ہے)

حَکَم: قاضی صاحب!
قاضی: جی حضور!
بادشاہ: کیا آپ نے ہمارا نیا محل دیکھ لیا ہے؟
قاضی: جہاں پناہ! میں نے پورے محل کی سیر کی ہے۔
بادشاہ: کیا آپ کو محل پسند آیا؟
وزیر اعظم: عالی جاہ! میں نے اپنی زندگی میں بے شمار شاہی محل دیکھے ہیں۔ مگر سچ کہتا ہوں ایسا شان دار اور عالی شان محل آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ اس محل کی بدولت آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔
بادشاہ: قاضی صاحب! آپ کی رائے کیا ہے؟
قاضی: آپ نے وزیر اعظم کی رائے سن لی ہے۔ اب اس کے بعد میں کیا عرض کروں؟
بادشاہ: نہیں، آپ اپنے رائے کا اظہار کریں۔

قاضی: میں اس محل کو اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔ واقعی بہت شان دار اور عالی شان ہے۔
بادشاہ: ہمیں خوشی ہے کہ جیسا خوب صورت محل چاہتے تھے، ہمیں مل گیا ہے۔ تاریخ یاد رکھے گی کہ ایک مسلمان بادشاہ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔
وزیر اعظم: ہسپانیہ کی ذات آپ پر فخر کرے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ!
بادشاہ: (قاضی کو غور سے دیکھ کر) قاضی جی!
قاضی: ارشاد حضور!
بادشاہ: ہم چاہتے ہیں کہ محل مکمل ہونے کی خوشی میں ان لوگوں کو انعامات دیں جو ہم سے بہت قریب ہیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟
قاضی: حضور! میں جو کچھ انعام کے طور پر چاہتا ہوں وہ میرے سامنے پڑا ہے۔
بادشاہ: کہاں؟
قاضی: حضور! یہ تھیلا۔
بادشاہ: یہ تھیلا!
قاضی: جی ہاں!
بادشاہ: اس میں کیا ہے؟
قاضی: اس محل کے باغ کی مٹی!
بادشاہ: (حیرت زدہ ہو کر) کیا کہا؟
قاضی: میں نے عرض کیا ہے کہ اس تھیلے میں باغ کی مٹی بھری ہوئی ہے۔
بادشاہ: (وزیر اعظم سے) قاضی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟
وزیر اعظم: حضور گستاخی معاف! میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ قاضی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟
قاضی: بات صرف اتنی ہے کہ میں نے سنا ہے۔ اس باغ کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ میں نے اس مٹی کا ایک تھیلا بھر لیا ہے، تاکہ اسے اپنے باغ میں لے جا کر پھیلا دوں۔
بادشاہ: قاضی صاحب! آپ سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟
وزیر اعظم: حضور! بظاہر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے دماغ میں کچھ خرابی ہو گئی ہے جو ایسی بے معنی بات کہہ رہے ہیں۔
قاضی: وزیر اعظم! جو بات آپ کے لیے بے معنی ہے۔ اس معاملے میں آپ دخل نہ دیں۔
بادشاہ: (وزیر اعظم سے) تم خاموش رہو۔
قاضی: تو جہاں پناہ! میں یہ مٹی کا بھرا ہوا تھیلا لے جانا چاہتا ہوں۔
بادشاہ: آپ کے ہاں پہنچ جائے گا۔ صرف یہ تھیلا نہیں، بہت سے تھیلے۔
قاضی: نہیں حضور! مجھے صرف ایک ہی تھیلا چاہیے۔
بادشاہ: یہی سہی۔
قاضی: محل کے دروازے پر گدھا کھڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تھیلا گدھے پر لاد کر لے جاؤں کیا آپ اسے اٹھانے میں میری مدد کریں گے؟
بادشاہ: قاضی صاحب!
وزیر اعظم: دیکھا حضور!
بادشاہ: قاضی جی!
قاضی: جہاں پناہ! کیا آپ میری مدد نہیں کریں گے؟
بادشاہ: اس کی ضرورت کیا ہے؟ ہمارے ساتھ کئی خادم آئے ہیں۔ ایک خادم ابھی اٹھا کر لے جاتا ہے۔
قاضی: حضور! میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں!
وزیر اعظم: قاضی جی! عقل سے کام لیجئے۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟
قاضی: وزیر اعظم! میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس معاملے میں دخل نہ دیجیے۔ میں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا ہے، وہی میری مدد کر سکتے ہیں یا انکار کر سکتے ہیں۔
بادشاہ: (وزیر اعظم سے) تم خاموش نہیں رہ سکتے تو چلے جاؤ۔
قاضی: تو کیجئے میری مدد۔
(بادشاہ تھیلے کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر نہیں اٹھا سکتا)

وزیر اعظم: حضور! یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔
بادشاہ: (غصے سے) خاموش!
قاضی: بادشاہ سلامت! ایک مرتبہ اور کوشش کیجئے۔
بادشاہ: یہ بہت بھاری ہے۔ میں نہیں اٹھا سکتا۔
قاضی: آپ نہیں اٹھا سکتے؟
بادشاہ: نہیں۔
قاضی: بادشاہ سلامت! اس تھیلے میں اس محل کی تھوڑی سی مٹی ہے، جسے آپ نہیں اٹھا سکتے اور جب قیامت کے روز آپ کو یہ پورا محل اٹھانا پڑے گا تو آپ کیا کریں گے؟
بادشاہ: پورا محل اٹھانا پڑے گا! وہ کیوں؟
قاضی: وہ اس وجہ سے کہ یہ ایک ایسی زمین پر کھڑا ہے جو ایک غریب بڑھیا کی ہے۔ بڑھیا کی زمین پر آپ کو کوئی حق نہیں تھا مگر آپ نے زبردستی اس پر اپنا محل بنا لیا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ یہ محل اس کی زمین سے الگ کر دیا جائے۔ کیا آپ قیامت کے روز اسے اپنے شانوں پر اٹھا کر الگ کر سکیں گے؟ بتائیے آپ کا کیا جواب ہے، بادشاہ سلامت؟
(بادشاہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہے)
بادشاہ: قاضی جی! تم نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست کہا ہے۔ واقعی بڑھیا کی زمین پر میرا کوئی حق نہیں تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر یہاں محل بنوا کر اس کے ساتھ میں نے نا انصافی کی ہے میں اپنے فعل پر سخت نادم ہوں۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔
قاضی: کیا آپ کی آنکھیں کھل گئیں؟
بادشاہ: جی ہاں قاضی صاحب! اللہ کی آپ پر لاکھ لاکھ رحمت ہو۔ مجھے آپ ایسے نڈر، جرات مند اور ایمان دار قاضی پر فخر ہے۔ آج سے یہ محل میرا نہیں اس بڑھیا کا ہے۔ میں ابھی بڑھیا کو بلا کر اس کے حوالے کیے دیتا ہوں! وزیر اعظم! بڑھیا کو بلاؤ۔
قاضی: جزاک اللہ! بادشاہ حَکَم کا نام دنیا میں اس وجہ سے زندہ نہیں رہے گا کہ اس نے یہ شان دار محل تعمیر کروایا، بلکہ اس وجہ سے زندہ رہے گا کہ اس نے انصاف کی خاطر یہ محل ایک غریب بڑھیا کو دے دیا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔
(پردہ گرتا ہے)
***

طلسمی صندوقچہ

پہلا منظر

(جمیل کا کمرا۔ سعید کی باہر سے آواز آتی ہے)

سعید: جمیل! کہاں ہو تم؟
جمیل: یہاں ہوں۔ ابا جان کے کمرے میں۔
(سعید اندر آتا ہے)
سعید: میں تمہیں ادھر باغ میں ڈھونڈتا رہا۔ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟
جمیل: کرنا کیا ہے۔ کوئی اچھی کتاب تلاش کر رہا ہوں۔ یار! آج اکرم کی سال گرہ ہے۔ اس نے بڑے زور سے دعوت دی ہے۔ تحفہ دینے کے لیے جیب میں کچھ ہے ہی نہیں۔ امی نے کچھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔
سعید: تو تحفے میں دینے کے لیے کتاب ڈھونڈ رہے ہو؟
جمیل: اور کیا؟
سعید: اور وہاں مجھے بھی جانا ہے۔ تحفہ مجھے بھی دینا ہے۔ اسی لیے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔

جمیل: کیا تحفے میں مجھے دینے کا ارادہ ہے؟ (ہنستا ہے)
سعید: تمہیں کیوں تحفے میں دوں گا۔ تمہاری جیب میں۔۔ ۔
جمیل: میری جیب میں کچھ ہوتا تو ابا جان کے کمرے کی بجائے کسی اچھی سی دکان سے کوئی اچھا سا تحفہ نہ خرید لیتا؟
سعید: میں تو سمجھا تھا تمہاری جیب میں کم از کم اتنے پیسے تو ہوں گے ہی جن سے سیر بھر مٹھائی ہی خرید لیں۔
جمیل: امی سے پانچ روپے مانگے تھے۔ کہنے لگیں، اب تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ جو کچھ لیتے ہو فوراً خرچ کر دیتے ہو۔ بہتیرا کہا، نہیں مانیں اور مانیں گی بھی نہیں۔ تم نے اپنی امی سے کیوں نہیں مانگا؟
سعید: وہ گھر پر ہیں ہی نہیں اور ہوتیں بھی تو کچھ نہ دیتیں۔ ابھی پرسوں ان سے دس روپے لیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ اب پورا مہینہ ایک پیسہ نہیں مانگوں گا۔
جمیل: سالگرہ میں جانا تو بہت ضروری ہے۔
سعید: کیسے کیسے دوست آئیں گے وہاں۔ اور پھر چائے، پیسٹری، مٹھائی۔
جمیل: تم تو سدا کے ندیدے ہو۔ میں کہتا ہوں اگر وہاں نہ گئے تو اکرم کیا کہے گا۔ خفا نہیں ہو جائے گا؟ لو بھئی! ہم نے تو اتنی محبت سے انہیں بلایا اور یہ نواب صاحب آئے ہی نہیں۔
سعید: سچی بات کیوں نہیں کہتے۔ وہ کہے گا اس لیے نہیں آئے کہ تحفے نہ دینا پڑیں۔
جمیل: یاد ہے میری سال گرہ پر اس نے کیسا خوب صورت ٹیبل لیمپ دیا تھا؟
سعید: واہ وا! کیا شان دار تجویز ذہن میں آئی ہے۔ ایسی تجویز ہے کہ تڑپ اٹھو گے۔ خوشی سے ناچ اٹھو گے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔
جمیل: تجویز کیا ہے؟
سعید: تجویز یہ ہے کہ وہ خوب صورت ٹیبل لیمپ تمہاری الماری میں پڑا ہہے۔ وہی۔۔ ۔
جمیل: چل ہٹ پاگل کہیں کا۔ میں نے کہا کوئی بڑی اچھی تجویز ہو گی۔ اپنا لیمپ پہچان نہیں لے گا وہ؟ پھر ابا امی مجھ سے پوچھیں گے کہ وہ لیپ کہاں ہے تو میں کیا جواب دوں گا؟
سعید: پھر کیا کیا جائے گا؟
جمیل: بتاؤ نا کیا کیا جائے؟
سعید: تم سوچو۔
جمیل: دونوں مل کر سوچتے ہیں۔ بس اب خاموش ہو جاؤ اور سوچ میں غرق ہو جاؤ!
سعید: یار! ڈوب جاؤں گا۔
جمیل: میں نکال لوں گا۔ بس اب خاموش!
(دو تین لمحے خاموشی۔ جمیل کی چھوٹی بہن راشدہ آتی ہے)
راشدہ: جمیل بھیا! ارے! یہاں تو سعید میاں بھی تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے کہا سعید!
(خاموشی)
راشدہ: جمیل بھیا! ہائے! تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے؟
جمیل: خاموش!
سعید: بالکل خاموش!
راشدہ: وہ کیوں؟
سعید: ہم سوچ رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ ہم سوچ میں غرق ہیں۔
راشدہ: غرق بعد میں ہونا۔ پہلے میری ایک چھوٹی سی بات سن لو۔ بات یہ ہے، کہ میری سہیلی عذرا کی گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہے۔ مجھے اس کی شادی پر کچھ دینا چاہیے۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں۔ تم دونوں بڑے اچھے بھائی ہو۔ ادھار دے دو نا۔
(سعید اور جمیل ہنس پڑتے ہیں)
راشدہ: ہنستے کیوں ہو؟ ہائے اللہ! ہنسے چلے جا رہے ہیں۔ بات بتاؤ نا۔
جمیل: راشدہ! عجیب معاملہ ہے۔ دو منٹ ہوئے میں نے سوچا تھا کہ اکرم کی سال گرہ پر تحفہ دینے کے لیے تم سے پیسے مانگوں گا اور تم الٹا ہم سے مانگ رہی ہو۔
راشدہ: امی نے پانچ روپے دیے تو تھے۔ پکنک پر گئے تو سارے کے سارے خرچ ہو گئے۔
سعید: راشدہ! اب تم بھی ہمارے پاس بیٹھ کر سوچو۔
راشدہ: سوچنے سے بھلا کیا ہو گا؟

جمیل: بس اب خاموش ہو جاؤ۔ میرے دماغ میں ایک بات آ رہی ہے۔ ہاں! یوں! بس!
راشدہ: ہاں! یوں! بس! یہ کیا ہوا بھلا؟
جمیل: سنو! میرے قریب آ جاؤ۔
راشدہ: صاف صاف بات کرو۔
جمیل: چند روز ہوئے۔ مگر نہیں۔
راشدہ: کہو بھی نا! خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں۔
سعید: بتاؤ جمیل!
جمیل: اس میں کچھ خطرہ ہے۔ مگر خیر، دیکھا جائے گا۔ چند روز ہوئے اختر نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دادا کے پاس ایک صندوقچہ ہے جس میں ہر وقت روپے موجود رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صندوقچہ انہیں کسی بزرگ نے دیا تھا اور یہ دعا دی تھی کہ یہ کبھی خالی نہ ہو اور یہ کبھی خالی نہیں ہوا۔
سعید: تمہارا مطلب ہے اختر سے کہیں کہ اس صندوقچے میں سے کچھ رقم لے لے، بعد میں جمع کر کے ہم رکھ دیں گے؟
راشدہ: بہت بری بات ہے۔
سعید: ہم اختر سے ادھار لیں گے۔
راشدہ: تو واپس کیوں کر کریں گے؟
سعید: اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو جو ہمیں جیب خرچ ملے گا اس میں سے سب سے پہلے یہ رقم ادا کریں گے۔ جتنے پیسے نکالیں گے اتنے وہاں جا کر رکھ دیں گے۔ یہ پیسے تو ہمارے پاس گویا ایک قسم کی امانت ہو گی۔ کیوں جمیل؟
جمیل: ہاں! امانت ہو گی۔
راشدہ: اختر مان جائے گا؟
جمیل: کیوں نہیں مانے گا۔ اس نے تو خود بھی کہا تھا کہ یار! میرا جی چاہتا ہے کسی دن اس صندوقچے کو کھول کر دیکھوں کہ اس میں ہے کیا۔
سعید: وہاں چلنا چاہیے۔
جمیل: ضرور چلنا چاہیے۔
(پردہ گرتا ہے)
**

دوسرا منظر

(اختر کا کمرا۔ اختر بیٹھا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے)

اختر: کون صاحب!
جمیل: ہم ہیں۔ میں، سعید اور راشدہ۔
اختر: اچھا!
(جمیل، سعید اور راشدہ تینوں داخل ہوتے ہیں)
تینوں: السلام علیکم!
اختر: وعلیکم السلام! آؤ۔ تینوں نے آج مل کر مجھ پر کیوں حملہ کر دیا ہے؟
جمیل: اس کی ایک خاص وجہ ہے۔
اختر: خدا خیر کرے۔ تم لوگوں کی نیت کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔
جمیل: سب سے پہلے تو ہمیں چائے پلاؤ۔
اختر: اور اس کے بعد؟
سعید: پہلے چائے کے لیے کہہ دو۔
اختر: (بلند آواز سے) ربانی! چائے بناؤ! اب کہو!
سعید: کہوں جمیل!
جمیل: تم کہو نا۔

راشدہ: اختر بھیا! یہ ایک خطرناک سکیم لے کر آئے ہیں۔ تمہارے دادا جان کا کوئی خاص صندوقچہ ہے نا؟
اختر: پھر؟
راشدہ: ہمیں سال گرہ اور گڑیا کی شادی پر تحفے دینے کے لیے روپوں کی ضرورت ہے۔
جمیل اور روپے ہمارے پاس نہیں ہے۔
اختر: وہ تو عام طور ہوتے ہی نہیں۔
جمیل: تو تو اختر! یہ صندوقچہ بڑا عجیب و غریب ہو گا۔ ہے نا؟
اختر: ہو گا۔ میں نے تو آج تک اسے دیکھا ہی نہیں۔ پتا نہیں۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ دادا جان کو کسی بزرگ نے دیا تھا اور یہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ ہاں! یاد آیا۔ محلے کی ایک بڑی بوڑھی نے بتایا تھا۔ مرچکی ہے بے چاری۔ لیکن مطلب کیا ہے تمہارا؟
سعید: مطلب یہ ہے کہ۔۔ ۔
راشدہ: مطلب یہ ہے کہ اس صندوقچے میں سے کچھ رقم نکال کر تحفے وغیرہ خرید لیں اور جتنی رقم نکالیں گے بعد میں واپس اس میں رکھ دیں۔
اختر: بالکل غلط۔
جمیل: ہم جو کچھ لیں گے، امانت کے طور پر لیں گے۔
سعید: اور واپس کر دیں گے۔
اختر: نہ بابا!
راشدہ: اچھا یہ تو بتاؤ یہ صندوقچہ ہے کہاں؟
اختر: اس کمرے کے ساتھ ایک کمرا ہے۔
راشدہ: اس میں کیا ہے؟
اختر: نہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور کمرا ہے۔ پھر ایک اور کمرا ہے۔ پھر ایک اور کمرا ہے۔ وہ کمرا آخری کمرا ہے۔ اس کے دروازے بند رہتے ہیں۔ وہاں کہیں ہے۔
جمیل: اختر! چلو۔ دیکھیں تو سہی ہے کیسا۔
اختر: جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ دیکھوں یہ صندوقچہ ہے کیسا؟
جمیل: آج دیکھ لیتے ہیں۔
سعید: کہتے ہیں اس میں ہر وقت دولت بھری رہتی ہے۔
اختر: بڑی بی نے بتایا تھا کہ اس میں سے خواہ کتنی دولت نکالیں، کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جو کچھ نکالیں وہ واپس آ جاتا ہے۔
سعید: واپس آ جاتا ہے؟
اختر: یہ بزرگ کی دعا کا اثر ہے۔
راشدہ: بہت ہی عجیب و غریب صندوقچہ ہے۔ تم نے کبھی نہیں دیکھا اختر؟
اختر: کبھی نہیں۔ مجھے صرف یہ خبر ہے کہ وہ آخری کمرے میں ہے؟ کہاں ہے؟ یہ خبر نہیں۔
جمیل: اب بھی بھرا ہو گا؟
اختر: ہر وقت بھرا رہتا ہے۔
سعید: آؤ دیکھیں!
اختر: امی اوپر کے کمرے میں ہیں۔ دادا جان باہر گئے ہوئے ہیں۔
سعید: میدان صاف ہے۔
اختر: میدان تو صاف ہے۔ مگر ڈر لگتا ہے۔
جمیل: اختر! ایسا طلسمی صندوقچہ نہ دیکھا تو پھر زندگی میں بھلا کیا دیکھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔
اختر: مگر اس میں سے نکالیں گے کچھ نہیں۔
سعید: نہیں نکالیں گے۔ مگر ڈھکنا اٹھا کر ضرور دیکھیں گے کہ اندر ہے کیا۔
جمیل: چلو بھئی اختر!
**

تیسرا منظر

(سٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے)

راشدہ: توبہ! کتنا اندھیرا ہے۔
جمیل: اختر! سوِچ کہا ہے؟
اختر: میں تو یہاں کبھی آیا ہی نہیں۔ کیا پتا سوِچ کہاں ہے۔
سعید: آگے چلو! سامنے دیوار کے ساتھ ہو گا۔
جمیل: یہ رہی دیوار____ یہاں تو کچھ نہیں۔
(راشدہ کی ہلکی سی چیخ)
سعید: کیا ہوا؟
راشدہ: پتا نہیں۔ میرے پاؤں سے کیا چیز لگی ہے۔
سعید: ادھر آ جاؤ۔ سوِچ ڈھونڈو اختر! اتنا اندھیرا ہے کہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔
اختر: سوِچ ڈھونڈھ رہا ہوں۔
(کسی شے کے گرنے کی آواز)
سعید: کیا ہوا؟
جمیل: میرا ہاتھ کسی سخت چیز کو لگا تھا۔
اختر: کچھ گرا دیا ہے۔
جمیل: اختر! سعید! مجھے کسی نے پکڑ لیا ہے۔
سعید: کہاں ہو تم؟
جمیل: یہاں ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے کسی نے بڑے زور سے۔
راشدہ: کھینچو!
جمیل: اس نے زور سے پکڑ لیا ہے!
سعید: ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔۔ یہ رہے تم۔۔ ارے؟ تم نے اپنا ہاتھ ایک برتن میں ڈال دیا ہے۔
جمیل: یہ کوئی برتن ہے؟
سعید: باہر نکال لو۔
راشدہ: ہائے! اوئی! سانپ! سانپ!
سعید: کہاں ہو تم راشدہ!
راشدہ: میں مر گئی۔ ابھی ابھی کوئی چیز میرے پاؤں سے چھوئی ہے۔
جمیل: اختر! سوِچ کیوں آن نہیں کرتے؟
اختر: میں نے کہا نہیں ہے کہ میں اس سے پہلے یہاں کبھی آیا ہی نہیں ہوں۔ معلوم نہیں سوِچ کہاں ہے۔
(کسی چیز کے گرنے کا شور)
جمیل: اف مر گیا!
اختر: جمیل!
جمیل: ہائے ہائے ہائے!
راشدہ: بھیا!
جمیل: میرے پاؤں پر کوئی چیز آ گری ہے۔
راشدہ: آؤ! باہر نکل جائیں۔
اختر: میں تم سے کہتا نہیں تھا کہ مت جاؤ۔
جمیل: اختر! میرے پاؤں پر سے یہ بھاری چیز اٹھاؤ۔ میں چل نہیں سکتا۔
اختر: تم گم کہاں ہو گئے؟
جمیل: یہاں ہوں۔

سعید: یہ تم ہو جمیل؟ تمہارا ہاتھ ہے نا؟
جمیل: ہاں! میرا ہاتھ ہے۔ جھک کر وہ چیز اٹھاؤ۔
سعید: پتا نہیں کیا ہے۔ بہت بھاری چیز ہے۔ (زور لگاتے ہوئے) او او او۔
راشدہ: ہٹ گئی وہ چیز؟
سعید: ہاں! اب خدا کے لیے نکلو۔
راشدہ: دروازہ کدھر ہے؟
اختر: ادھر ہے، جہاں سے آئے تھے۔
راشدہ: کہاں سے آئے تھے؟
اختر: جدھر دروازہ ہے۔
راشدہ: تمہیں اب بھی مذاق سوجھ رہا ہے ادھر جان پر بنی ہے۔ بتاؤ نا دروازہ کہاں ہے؟
سعید: ادھر ہے۔ نہیں نہیں ادھر نہیں ہے-- - یہاں تو دیوار ہے۔
راشدہ: باہر کیسے نکلیں؟ ذرا سی روشنی نہیں ہے۔ دروازے کا پتا ہی نہیں کہاں ہے۔
جمیل: ہر طرف دیوار ہے۔
راشدہ: (چیخ مار کر) مر گئی۔
جمیل: راشدہ!
راشدہ: گر پڑی ہوں (روتے ہوئے) ہائے اللہ! مر گئی۔
جمیل: اختر! دروازہ کہاں ہے؟
سعید: جمیل! یہ کیا چیز ہے میرے پاؤں میں؟ مجھے جکڑ لیا ہے اس نے۔
(دادا جان کی باہر سے آواز)
دادا جان: کون ہے اندر؟
(خاموشی) میں پوچھتا ہوں کون ہے؟
سعید: (سرگوشی میں) اختر! بولو!
اختر: دادا جان!
دادا جان: اختر تم ہو؟
(دادا جان سوِچ دبا کر روشنی کرتے ہیں)
دادا جان: ارے! یہ کیا! راشدہ تم؟ اور ہیں جمیل! یہ قصہ کیا ہے؟
(خاموشی)
بولتے کیوں نہیں؟ تم لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟
اختر: دادا جان!
جمیل: ہائے!
دادا جان: پاؤں کو کیا ہوا جمیل؟ اس سے تو لہو بہہ رہا ہے۔ ٹھہرو! اوپر اٹھاؤ پاؤں۔ بس! اب بتاؤ ہوا کیا ہے؟
راشدہ: میں بتاتی ہوں دادا جان! ہم نے سنا تھا کہ آپ کے پاس ایک طلسمی صندوقچہ ہے۔ جس میں ہر وقت روپے بھرے رہتے ہیں۔
دادا جان: صندوقچہ!
راشدہ: جی ہاں! ہم نے کہا دیکھیں یہ صندوقچہ ہے کیسا اور----
سعید: انہیں کچھ روپوں کی بھی ضرورت تھی۔
دادا جان: یہ تمہاری غلطی تھی۔ اس کی سزا تمہیں ملی ہے۔ ملی ہے نا؟
جمیل: جی ہاں!
دادا جان: اب میں تمہیں اس طلسمی صندوقچہ کی کہانی سناتا ہوں۔ پہلے وہ صندوقچہ لے آؤں۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ چلو کمرے میں۔
(پردہ گرتا ہے)
**

چوتھا منظر

(اختر کا کمرا۔ جمیل، اختر، راشدہ اور سعید کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دادا جان بھی ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک صندوقچہ ہے)

دادا جان: یہ رہا جادو کا صندوقچہ۔ دیکھو! اور اب اس کے اندر بھی دیکھ لو۔ دیکھ رہے ہو؟
(دادا جان سب کو صندوقچے کا اندرونی حصہ دکھاتے ہیں)
جمیل: جی ہاں!
راشدہ: دادا جان! اس کے اندر تو چند روپے پڑے ہیں!
دادا جان: یہ دیکھو روپے! لو اب اس کی کہانی سناتا ہوں۔ آج سے پچاس پچپن سال پہلے کی بات ہے، ایک تھا لڑکا۔ اچھا ہونہار تھا مگر اس میں جہاں خوبیاں تھیں وہاں ایک برائی بھی تھی۔ برائی یہ تھی کہ وہ کفایت شعار نہیں تھا۔ جو کچھ ملتا تھا فوراً خرچ کر دیتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک میلے پر گیا۔ اس لڑکے نے سب کچھ خرچ کر دیا ہے۔ دوستوں سے بھی الگ ہو گیا۔ جب شام ہونے لگی تو لوگ میلے سے جانے لگے۔ وہ بھی جانے لگا۔ سب تانگوں پر جا رہے تھے۔ اس کی جیبیں خالی تھیں۔ وہ کیسے تانگے پر بیٹھتا۔ پیدل گھر کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد راستا بھول گیا اور کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ رات اندھیری تھی۔ بادل گرج رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ ہوا بہت تیز تھی۔ سن رہے ہو نا۔
اختر: جی ہاں! سن رہے ہیں۔
دادا جان: خوش قسمتی سے وہاں ایک شخص آ گیا اور وہ اس بچے کو اپنے گھر لے گیا۔ بچے کو کھانا کھلایا اور پھر اسے ایک صندوقچہ دیا اور کہا دیکھو! میں ایک نہایت قیمتی تحفہ تمہیں دے رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ ہر روز اس میں ایک پیسہ ڈالتے رہو گے پھر یہ کبھی خالی نہیں ہو گا۔ سنا تم نے؟
راشدہ: جی ہاں!
دادا جان: تو بچو! وہ بچہ اب یہ دادا جان بن چکا ہے۔
سب: دادا جان!
دادا جان: اور وہ صندوقچہ۔ جو ایک نیک شخص نے دیا تھا۔ تم آج میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو۔
جمیل: اچھا! یہی وہ صندوقچہ ہے۔
دادا جان: ہاں بیٹا! اس دن سے لے کر آج تک میں نے اس صندوقچے کو کبھی خالی نہیں رکھا۔ باقاعدگی کے ساتھ اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتا رہتا ہوں اور چوں کہ اس میں کچھ ڈالنا ضروری ہے اس لیے میں فضول خرچی سے کام نہیں لے سکتا۔ کفایت کر کے صندوقچے کے لیے پیسے بچاتا ہوں۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ میں کفایت شعار ہو گیا ہوں اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں کبھی کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی خاص ضرورت پڑتی ہے، ضرورت کی رقم اس میں سے نکال لیتا ہوں۔ تو یہ ہے بچو! اس طلسمی صندوقچے کی کہانی۔
سعید: میں بھی کفایت شعاری کروں گا۔
راشدہ: میں بھی۔
اختر اور جمیل: اور میں بھی۔
(پردہ گرتا ہے)
***

احسان کا بدلہ

پہلا منظر

(شہر بغداد۔ ایک شان دار مکان کا دیوان خانہ۔ صبح کا وقت۔ خلیفہ مہدی کے مرحوم وزیر اعظم ابو خالد کا بیٹا احمد کرسی پر

اس طرح بیٹھا ہے جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ لباس میلا کچیلا اور چہرے کا رنگ زرد ہے۔ احمد کی ماں کمرے میں آتی ہے)

ماں: احمد بیٹا!
احمد: جی اماں جان!
ماں کیا بات ہے بیٹا؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟
احمد: نہیں، ویسے ہی بیٹھا ہوں۔
ماں: بیٹا! ماں سے اپنی حالت چھپاؤ نہیں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ ہمارے مذہب میں مایوس ہونا بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ تم یہ بات جانتے نہیں ہو؟
احمد: جانتا ہوں اماں!
ماں: پھر بھی مایوس ہو؟
احمد: میں کیا کروں۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ملازمت کے لیے پوری پوری کوشش کی ہے مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔
ماں: کیا مجھے یہ بات معلوم نہیں ہے؟
احمد: وزیر اعظم کا بیٹا اور یوں در بدر کی ٹھوکریں کھائے۔ آج میرا باپ زندہ ہوتا تو میں اس طرح مایوس ہوتا؟ آسانی سے بڑی سے بڑی ملازمت مل جاتی لیکن آج۔۔
ماں: فکر نہ کرو بیٹا!
احمد: فکر کیوں نہ کروں۔ ہماری حالت روس بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ گھر میں جتنا روپیہ تھا سب کا سب ختم ہو چکا ہے۔ اب کیا ہو گا؟ کس طرح گزارہ ہو گا۔
ماں: اللہ رازق ہے۔
(ماں بیٹے کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)
احمد: اللہ رازق ہے مگر انسان کو تو کوشش کرنی چاہیے نا۔
ماں: تم نے ہر طرح سے کوشش کی ہے۔ کہاں کہاں نہیں گئے۔ کس کس سے نہیں ملے۔
احمد: کل کیا ہو گا اماں! کیا ہمیں فاقہ کرنا پڑے گا۔
ماں: فاقہ کیوں کریں گے۔ میں نے تھوڑی سی رقم بچا رکھی ہے۔ اس سے گھر کا خرچ چلے گا۔
احمد: اور جب یہ رقم ختم ہو گئی تو۔۔؟
ماں: کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔
احمد: کیا بندوبست ہو گا۔ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔
ماں: بیٹا!
احمد: جی اماں! فرمائیے!
ماں: تیرے باپ کے بے شمار دوست تھے۔ اور یہ سارے دوست بڑے اونچے عہدوں پر تھے۔ ان میں سے کچھ آج بھی زندہ ہیں۔
احمد: زندہ ہیں تو کیا ہوا۔ آپ شاید یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں مرحوم ابا جان کے کسی دوست کے پاس جاؤں اور ان سے مدد مانگوں۔
ماں: اس میں حرج کیا ہے؟
احمد: اماں! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کو پتا نہیں کہ جب کوئی امیر آدمی غریب ہو جاتا ہے تو امیر لوگ اس سے کیا سلوک کرتے ہیں؟ جب تک ہمارے پاس دولت تھی سب عزت سے پیش آتے تھے لیکن آج کوئی پوچھتا تک نہیں۔ میرا تو دل ٹوٹ گیا ہے۔ کسی سے ملنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔
ماں: تو جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے مگر بیٹا! اس طرح نا امید ہو کر گھر میں بیٹھ جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔
احمد: اب کیا کروں اماں جان!
ماں: کسی سے ملو۔
احمد: کس سے ملوں؟ لوگ تو میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔
ماں: یہ بات میں نہیں مانتی۔ دنیا میں جہاں برے لوگ ہیں وہاں اچھے بھی ہیں۔ تم کسی کے پاس جا کر دیکھو تو سہی۔
احمد: اماں! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ ہم اس شہر میں نہیں رہیں گے۔

ماں: بیٹا! ہم اپنا شہر کیوں چھوڑیں!
احمد: اماں! یہاں میری کوئی عزت نہیں ہے۔ کسی اور شہر میں جا کر معمولی سے معمولی کام بھی کر لوں گا۔ وہاں جاننے والے لوگ نہیں ہوں گے۔
ماں: اتنی جلد اتنا بڑا فیصلہ کر لینا مناسب نہیں ہے۔
احمد: اس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟
ماں: احمد!
احمد: فرمائیے! اماں جان!
ماں: میری ایک خواہش پوری کرو گے؟
احمد: حکم دیں اماں جان! آپ کا ہر حکم ماننا میرا فرض ہے۔
ماں: مجھے یاد پڑتا ہے کہ تمہارے ابا جان نے ایک مرتبہ یحییٰ کی مدد کی تھی اور آج یحییٰ خلیفہ ہارون رشید کے وزیر ہیں۔
احمد: ایک زمانے میں یحییٰ صاحب بڑے غریب ہو گئے تھے۔ اس وقت ابا جان کے پاس آئے تھے اور ابا جان نے ان کی پوری مدد کی تھی۔
ماں: آج یحییٰ کے محسن کا بیٹا سخت غریب ہو گیا ہے۔ کیا وہ اس کی مدد نہیں کریں گے؟
(احمد سوچنے لگتا ہے)
سوچ کیا رہے ہو بیٹا۔ ان سے ملو جا کر۔
احمد: نہیں اماں! میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔
ماں: کیسے پاگل ہو۔ گھر بیٹھے ہی سمجھ لیا کہ وہ تمہاری صورت دیکھنے کی روا دار نہیں ہیں۔
احمد: اب تک میرے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔
ماں: کیا ضروری ہے کہ سب لوگ ایک جیسا ہی سلوک کریں؟
احمد: اماں! آپ حکم دیں گے تو چلا جاؤں گا۔ ویسے میرا دل بالکل نہیں چاہتا۔
(ماں کرسی سے اٹھ کر بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔ احمد اٹھ بیٹھتا ہے)
ماں: شاباش بیٹا! اچھی اولاد ماں باپ کی بات ٹالتی نہیں، کب جاؤ گے؟
احمد: کل صبح چلا جاؤں گا۔
ماں: تمہارے لیے رات کو صاف ستھرے کپڑوں کا انتظام کر دوں گی۔
احمد: بہتر اماں جان!
**

دوسرا منظر

(خلیفہ ہارون رشید کے وزیر یحییٰ کے محل کا ایک کمرا۔ یحییٰ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ خادم آتا ہے)

خادم: حضور! ایک نوجوان خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔
یحییٰ: کون ہے؟
خادم: کہتا ہے تم جا کر صرف یہ اطلاع دے دو کہ ایک نوجوان آیا ہے۔
یحییٰ: نام نہیں بتایا؟
خادم: جی نہیں۔
یحییٰ: لے آؤ!
(خادم چلا جاتا ہے۔ چند لمحوں بعد اس کے ساتھ احمد آتا ہے)
احمد: السلام علیکم چچا جان!
یحییٰ: وعلیکم السلام۔ آؤ احمد بیٹا!
احمد: آپ نے مجھے پہچان لیا ہے؟
یحییٰ: جب تمہارے اب جان زندہ تھے تو میں کئی مرتبہ ان سے ملا تھا۔ دو تین بار تمہیں بھی ان کے ساتھ دیکھا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔

(احمد ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
احمد: شکریہ چچا جان!
(یحییٰ دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جہاں خادم کھڑا ہے)
یحییٰ: ہمارے بیٹے کے لیے شربت لاؤ۔
احمد: چچا جان! تکلیف نہ کریں۔
(خادم چلا جاتا ہے)
احمد: چچا جان! میں ایک خاص مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔
یحییٰ: کہو کیا مقصد ہے تمہارا؟
احمد: چچا جان! جب تک ابا جان زندہ تھے گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔ ان کے فوت ہو جانے کے بعد ساری ذمہ داریاں میرے کندھے پر آ پڑی ہیں۔ میں ہی ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔
یحییٰ: مجھے خبر ہے۔
احمد: میں نے ملازمت کے لیے بڑی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔
(خادم طشت میں شربت کے دو گلاس لے کر آتا ہے۔ ایک گلاس یحییٰ اٹھا کر احمد کو دیتے ہیں دوسرا خود لے لیتے ہیں)
احمد: مجھے یہ بات زبان پر لاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔
یحییٰ: مجھے یہ سن کر دکھ ہوا ہے۔
احمد: آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ ماشاء اللہ وزیر ہیں۔ میرے لیے اچھی سے اچھی ملازمت کا بندوبست کر سکتے ہیں۔
(یحییٰ کا بیٹا منصور آتا ہے۔ احمد اپنا گلاس طشت میں رکھ دیتا ہے۔ خادم طشت لے جانے لگتا ہے)
یحییٰ: آؤ منصور بیٹا۔ ان سے ملو۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟
منصور: نہیں ابا جان!
یحییٰ: یہ مرحوم وزیر اعظم ابو خالد کے بیٹے احمد ہیں۔
(احمد اٹھ کر منصور سے مصافحہ کرتا ہے)
منصور: ابا جان! میں ان کے ساتھ بچپن میں کھیل چکا ہوں۔ احمد بھائی! کیا آپ منصور کو بھول گئے ہیں؟
احمد: جی نہیں۔ مجھے اپنا بچپن کا ساتھی کیوں کر بھول سکتا ہے۔
یحییٰ: اچھا تو احمد بیٹا! میں نے تمہارا معاملہ سمجھ لیا ہے۔ تمہارے لیے کچھ کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔ کوئی گنجائش نکلی تو تمہیں تمہیں اطلاع مل جائے گی۔ اس وقت تمہارے لیے کوئی مناسب ملازمت نہیں ہے۔
(احمد ان لفظوں سے مایوس ہو جاتا ہے)
احمد: بہت بہت شکریہ! اب مجھے جانے کی اجازت دیں۔
یحییٰ: جانا چاہتے ہو؟ اچھا جاؤ!
(احمد سلام کر کے چلا جاتا ہے)
منصور: (حیرت سے) ابا جان!
یحییٰ: کیوں بیٹا!
منصور: یہ آپ کی نہایت عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ آپ نے ایسے روکھے پن سے اسے رخصت کر دیا ہے؟
یحییٰ: بیٹا! واقعی اس کے لائق کوئی خدمت نہیں ہے۔
منصور: آپ اس کی مدد کر سکتے تھے۔
یحییٰ: میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔
منصور: کیوں؟ ابا جان!
یحییٰ: منصور بیٹا! تم نہیں جانتے، اس کے باپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا تھا۔
منصور: ابا جان! آپ نے ایک مرتبہ پہلے بھی کہا تھا کہ ابو خالد مرحوم نے آپ کی ذات پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ احسان کیا تھا؟
یحییٰ: بیٹا! ایک زمانے میں میرا سارا کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔ اس وقت میں ابو خالد کے پاس پہنچا اور اسے ساری حالت بتا دی۔ ابو خالد نے صرف یہ کہا کہ میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا اور مجھے رخصت کر دیا۔ مجھے سخت دکھ ہوا۔ دوسرے دن میں شہر چھوڑنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے مجھے خلیفہ مہدی کا فرمان دیا جس میں لکھا

تھا کہ تم کو کوفے کا گورنر مقرر کیا جا رہا ہے۔ یہ میرے دوست خالد کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔
منصور: انہوں نے ہی خلیفہ سے سفارش کی ہو گی۔
یحییٰ: یقیناً۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا۔ خوب محنت کی، دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا اور آج میں خلیفہ ہارون رشید کا وزیر ہوں۔ اگر ابو خالد میری سفارش نہ کرتے اور مجھے کوفے کو گورنر مقرر نہ کرتے تو نہ جانے میرے ساتھ کیا پیش آتا اور میں کتنے دکھ اٹھاتا۔ آج اس کا بیٹا مجھ سے مدد مانگنے آیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس کے لیے کیا کروں۔ کسی عام ملازمت کا بندوبست کرنا یا مالی مدد کرنا مجھے منظور نہیں۔
منصور: آپ کو احساس ہے کہ احمد کے ابا جان نے آپ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔
یحییٰ: ہاں بیٹا! مجھے یہ احساس ہے۔ میں اس کو کوئی ایسی ملازمت دلا کر جس میں میری اپنی قربانی شامل نہ ہو، اس کے باپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔
منصور: تو آپ کیا چاہتے ہیں؟
یحییٰ: تمہارا مشورہ کیا ہے؟
منصور: ابا جان! مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔ کل صبح بتا سکوں گا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔
یحییٰ: میں بھی سوچتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی مناسب تجویز تمہارے یا میرے ذہن میں آ ہی جائے گی۔
(پردہ گرتا ہے)
**

تیسرا منظر

(احمد کے مکان کا کمرا۔ احمد اور اس کی ماں باتیں کر رہے ہیں)

احمد: اماں! اب اس شہر میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
ماں: ایک مرتبہ پھر سوچ لو بیٹا!
احمد: اماں! آپ نے کہا کہ یحییٰ سے مل آؤں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہیں اپنی حالت بتائی مگر انہوں نے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں لی۔
ماں: حیرت ہے۔ وہ احمد کے باپ کا احسان بھول گئے۔
احمد: لوگ احسان بھول ہی جایا کرتے ہیں اماں جان! میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ غریبی میں کوئی شخص بھی ساتھ نہیں دیتا۔ آپ نے اصرار کیا۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔
ماں: تو تم نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ اب ہم اس شہر میں نہیں رہیں گے؟
احمد: اماں جان! بتائیے اب ہم یہاں رہ کر کیا کریں گے؟ کسی اور شہر جا کر میں ہر وہ کام کر سکوں گا جو یہاں نہیں کر سکتا۔
ماں: کاش تمہیں یہیں کوئی مناسب ملازمت مل جاتی۔
احمد: مل جاتی تو اور کیا چاہیے تھا۔
ماں: اب اس شہر میں رہنا ہماری قسمت میں نہیں ہے۔
احمد: اماں جان! میرا دل نہیں چاہتا کہ کہیں اور جائیں مگر کیا کروں۔ یہاں گزارہ کس طرح چلے گا۔
ماں: تو ٹھیک کہتا ہے بیٹا!
احمد: ہم آج ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں نے ایک شخص سے کہا ہے۔ وہ کسی وقت یہاں آ کر سارا سامان خرید لے گا۔ اس رقم سے کہیں اور جانے کا انتظام ہو جائے گا۔
ماں: جائیں گے کہاں؟
احمد: دمشق۔
ماں: اچھا! اللہ کو یہی منظور تھا۔
(دروازے پر دستک ہوتی ہے)
کون ہے دروازے پر؟
احمد: دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی پرانا واقف کار ہو گا۔

(احمد باہر نکل جاتا ہے اور پھر جلدی سے واپس آتا ہے۔ چہرہ خوشی سے سرخ ہے)
احمد: اماں جان!
ماں: کون ہے بیٹا!
احمد: اماں جان! یحییٰ آئے ہیں۔
ماں: وزیر یحییٰ!
احمد: ہاں! اماں جان!
ماں: اندر لے آؤ بیٹا!
(ماں نقاب سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے احمد دروازے پر جاتا ہے اور یحییٰ کو ساتھ لے کر آتا ہے)
یحییٰ: السلام علیکم عزیز بہن!
ماں: وعلیکم السلام بھائی جان!
یحییٰ: میں نے سنا ہے کہ ماں بیٹا دمشق جا رہے ہیں۔
ماں: مجبوری ہے۔
یحییٰ: احمد کا چچا ابھی زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں آپ بغداد چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جا سکتے۔
ماں: ہم آپ کے مہمان بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔
یحییٰ: آپ کو میرا مہمان نہیں بننا پڑے گا۔ احمد کو بہت بڑا عہدہ ملے گا۔
احمد: وہ کیسے چچا جان؟
یحییٰ: وہ ایسے! (یحییٰ جیب سے ایک کاغذ نکالتا ہے) یہ دیکھ رہے ہو بیٹا؟
احمد: دیکھ رہا ہوں۔
یحییٰ: یہ خلیفہ کا فرمان ہے تمہارے نام۔ اس میں تمہیں وزیر مقرر کیا گیا ہے۔
(احمد اور اس کی ماں حیرت سے یحییٰ کو دیکھنے لگتے ہیں)
بیٹا! اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں میں نے وزارت سے استعفا دے دیا ہے اور تمہارے نام کی سفارش کی ہے۔ خلیفہ نے میری سفارش مان لی ہے۔
احمد: مگر چچا جان!
یحییٰ: میں جانتا ہوں کہ تمہارے باپ نے کس طرح تمہاری تربیت کی ہے۔ تم وزارت کی ذمہ داریاں بڑی عمدگی سے پوری کر سکتے ہو،
ماں: بھائی جان! آپ نے کیا کیا!
یحییٰ: مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ میں خوش ہوں کہ اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کی کچھ خدمت کر رہا ہوں۔ یہ اس کے احسان کا بدلہ نہیں ہے۔ میری طرف سے اس کے احسان کا اعتراف ہے۔ میرے محسن کا بیٹا میری زندگی میں پریشان نہیں ہو سکتا۔ بیٹا! اب میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔ خلیفہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔
(احمد اور اس کی ماں احسان مندی سے یحییٰ کو دیکھ رہے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)
***

ماخذ:
اردو محفل (ٹائپنگ: عائشہ عزیز)
https://www.urduweb.org/mehfil/threads/%D9%88%DB%81-%D9%84%DA%91%DA%A9%DB%8C-%DA%A9%D9%88%D9%86-%D8%AA%DA%BE%DB%8C%D8%9F-%D9%85%DB%8C%D8%B1%D8%B2%D8%A7-%D8%A7%D8%AF%DB%8C%D8%A8.57765/#post-1147275
تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید